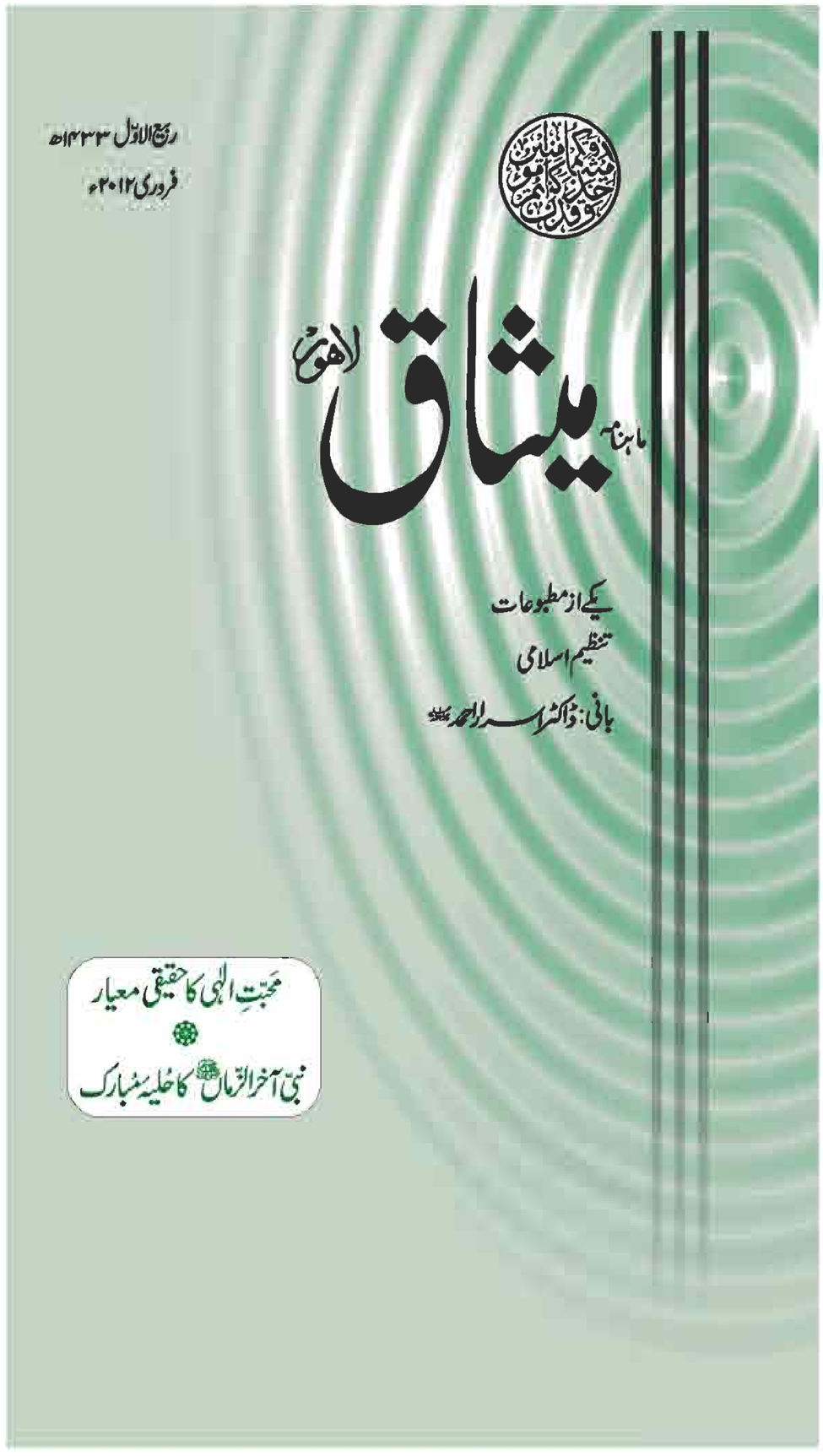

ربیع الاول ۱۴۳۳ھ
فروری ۲۰۱۲ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات
تنظیم اسلامی
بانی: ڈاکٹر اسرار احمد ؒ

محبتِ الٰہی کا حقیقی معیار

نبی آخرالزماں ﷺ کا حلیہ مبارک

غنیمت جانو!

عَنْ عَمْرِو بْنِ مَیْمُوْنِ الْأَوْدی ؓ قَالَ قَالَ رَسُوْلُ اللّٰہِ ﷺ لِرَجُلٍ وَھُوَ یَعِظُہٗ:

اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ :

① شَبَابَكَ قَبْلَ هَرَمِكَ
② وَصِحَّتَكَ قَبْلَ سَقَمِكَ
③ وَغِنَاكَ قَبْلَ فَقْرِكَ
④ وَفَرَاغَكَ قَبْلَ شَغْلِكَ
⑤ وَحَيَاتَكَ قَبْلَ مَوْتِكَ (رواہ الترمذی مُرسلًا)

حضرت عمرو بن میمون الاودی ؓ روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ایک شخص کو نصیحت کرتے ہوئے ارشاد فرمایا:

پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو:

① اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے!
② اپنی صحت کو بیماری سے پہلے!
③ اپنی دولت مندی کو محتاجی سے پہلے!
④ اپنی فراغت کو مصروفیت سے پہلے!
⑤ اپنی زندگی کو موت سے پہلے!

وَاذۡكُرُوۡا نِعۡمَةَ اللّٰهِ عَلَيۡكُمۡ وَمِيۡثَاقَهُ الَّذِىۡ وَاثَقَكُمۡ بِهٖۤ ۙ اِذۡ قُلۡتُمۡ سَمِعۡنَا وَاَطَعۡنَا ۫ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد :	61
شمارہ :	2
ربیع الاوّل	1433ھ
فروری	2012ء
فی شمارہ	-/25

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِ تعاون

اندرون ملک	250 روپے
بھارت وبنگلہ دیش	900 روپے
ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ	1200 روپے
امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ	1500 روپے

ترسیل زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقام اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000 ای میل: publications@tanzeem.org
ویب سائٹ ایڈریس: www.tanzeem.org
مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: 67۔ علامہ اقبال روڈ، گڑھی شاہو لاہور
فون: 36366638 - 36316638 فیکس: 36271241

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 3
اُمت مسلمہ؟
ایوب بیگ مرزا

بیانُ القرآن — 5
سورۃ الاعراف (آیات ۱۷۹ تا ۲۰۶)
ڈاکٹر اسرار احمد

حقیقت دین — 22
محبت الٰہی کا حقیقی معیار
عتیق الرحمٰن صدیقی

اُسوہ و سیرت — 33
نبی آخر الزمان ﷺ کا حلیہ مبارک
حافظ محمد زاہد

حیاتِ جاودانی — 51
شہادت فی سبیل اللہ : ضرورت، اہمیت اور فضائل
پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اقبالیات — 57
کلام اقبال۔ قرآن کے ترازو میں
پروفیسر عبداللہ شاہین

دعوتِ فکر — 65
ہمارے مسائل کا حل اور دجالی نظام کا مقابلہ
محمد رشید عمر

تقابل ادیان — 75
موجودہ عیسائیت۔ دین مسیح یا سینٹ پال کی تحریفات؟
وقار احمد

بسم اللّٰہ الرحمٰن الرّحیم

اُمّتِ مُسلمہ؟

امت مسلمہ قرآنی اصطلاح ہے۔ اس امت کے افراد کے باہمی تعلق اور رشتہ کی نبی اکرم ﷺ نے تعریف یوں فرمائی: ''ایک دوسرے پر مہربانی کرنے اور دوستی وشفقت کرنے میں تم مؤمنوں کو ایک جسم کی طرح دیکھو گے کہ جسم کے ایک حصہ کو تکلیف ہوتی ہے تو سارا جسم بیداری اور بخار میں اِس کا شریک ہو جاتا ہے''۔ (صحیح مسلم) جب تک مسلمانوں کی یہ صورتِ حال رہی اسلام غالب رہا۔ تاریخ گواہ ہے کہ مسلمانوں نے دنیا کے ایک بڑے حصے کو جتنی سرعت سے زیرنگیں کیا تھا کوئی دوسری قوم نہ کرسکی اور جتنے طویل عرصہ تک مسلمان دنیا میں سپر قوت کی حیثیت سے رہے کوئی اور قوم نہ رہ سکی۔ لیکن آج امت مسلمہ محض ایک خوبصورت اصطلاح سے زیادہ کچھ نہیں۔ زیادہ سے زیادہ یہ کہا جاسکتا ہے کہ قرآن کی اصطلاح ہونے کی وجہ سے مسلمانوں کے لیے ایک مقدس اور قابل احترام اصطلاح ہے' لیکن امت مسلمہ کا کوئی حقیقی اور دکھائی دینے والا وجود نہیں ہے۔ دنیا بھر میں ستاون کے قریب اسلامی ممالک ہیں' سب کے جھنڈے الگ الگ ہیں' کرنسی مختلف ہے۔ مسلمان ممالک کے شہریوں کو باہمی آمدورفت کے لیے پاسپورٹ ہی نہیں ویزا بھی لینا پڑتا ہے۔ بات یہیں پر ختم نہیں ہوجاتی' بعض اسلامی ممالک برادر اسلامی ملک سے دشمنی اور عداوت کا رشتہ بھی رکھتے ہیں۔ عراق ایران جنگ تو ماضی قریب کی بات ہے جس میں بے شمار مسلمان ایک دوسرے کے ہاتھوں قتل ہوئے۔ ہمیں اِن سطور میں امت مسلمہ کی زبوں حالی کے اسباب پر بحث نہیں کرنی اور نہ ہی ایک مختصر سی تحریر میں ان اسباب کا احاطہ کرنا ممکن ہے' اِس موضوع پر ضخیم کتابیں لکھی جاچکی ہیں' جن کا خلاصہ یہ ہے کہ دین سے دوری' دنیا پرستی' اقتدار کی ہوس' آخرت فراموشی اور علم سے اجتناب ہی نہیں علم دشمنی اُمت مسلمہ کے زوال اور موجودہ زبوں حالی کا باعث بنی۔ امت مسلمہ ایک حقیقت' ایک قوت کیسے بن سکتی ہے' اِس کا آسان جواب تو یہ ہے کہ اِن اسباب کو دور کیا جائے' لیکن اس کے ساتھ ساتھ ہمیں یہ طے کرنا ہوگا کہ عصر حاضر کے تقاضوں کو مدنظر رکھ کر کس طرز پر جدوجہد

کی جائے۔ مسلمانوں کو یہ جدّوجُہد کیوں کرنا ہوگی؟ اِس کا فوری جواب تو یہ ہے کہ ہر نظام اپنا غلبہ چاہتا ہے اور اسلام اِس حوالہ سے بہت زیادہ حساس ہے۔ مغلوب اسلام کو تو دین کا نام ہی نہیں دیا جاسکے گا۔ ایسی صورت میں تو عالم اسلام میں دن میں پانچ مرتبہ گونجنے والی صدا ''اللہ اکبر'' محض ایک رسم بن کر رہ جائے گی۔ پھر یہ کہ پیغمبر آخرالزماں محمد مصطفیٰ ﷺ کی رسالت کا قیامت تک قائم رہنے کا عقیدہ رکھنے والی اُمت پر آپ ﷺ کے لائے ہوئے نظام کو ہر دور میں ایک حقیقت اور ایک قابل عمل نظام ثابت کرنے کے لیے جدوجہد کرنا اولین فرض ہے۔ وہ ایسا نہیں کرتے تو گویا ایک دینی فریضہ کی انجام دہی میں ناکام رہتے ہیں۔

اُمت مسلمہ کے حقیقی وجود کو قائم کرنے اور دنیا سے تسلیم کروانے کے لیے مسلمانوں کو تین بڑی رکاوٹیں دور کرنا ہوں گی۔ صحیح تر الفاظ میں مسلمانوں کو تین سطحوں پر جدوجہد کرنا ہوگی یا تین قسم کی قوتوں سے جنگ کرنا ہوگی۔ اِس سلسلہ کی سب سے بڑی رکاوٹ مسلمان ممالک کے وہ حکمران ہیں جو خود ذہناً سیکولر ہیں اور سیکولر دنیا کی قوت اور ٹیکنالوجی میں ترقی سے مرعوب ہی نہیں خوفزدہ بھی ہیں اور وہ اِن اسلام دشمن قوتوں کی ڈکٹیشن پر چلتے ہیں' لہٰذا مسلمانوں کے اتحاد یا اُن کی کسی متحرک تنظیم کی عملاً مخالفت کرتے ہیں' چاہے اپنے مسلمان عوام کو دھوکہ دینے کے لیے زبانی کچھ بھی کہتے رہیں۔ کسی ایک ملک یا ریاست میں اِس سب سے بڑی رکاوٹ کو دور کرنے کے لیے نبوی انقلاب کے منہج کو اپنانا ہوگا۔ دوسری رکاوٹ خدا دشمن اور اسلام دشمن ذہین ایلیٹ ہے جو اسلامی انقلاب کے راستے کی رکاوٹ کے علاوہ بعد از انقلاب counter revolution کی کوشش کرسکتے ہیں۔ اُن کا علمی سطح پر مقابلہ کرنے کے لیے تیاری کی جائے' یعنی ایسے افراد تیار کیے جائیں جو عصر حاضر کے چیلنج قبول کرنے اور متبادل راہیں اختیار کرنے کی صلاحیت حاصل کرلیں۔ حقیقی اور اپنی حیثیت منوانے والی امت مسلمہ کے راستے میں علاقائی' لسانی اور نسلی تعصب بھی حائل ہے۔ اِن تعصّبات کو بڑی حکمت سے ختم کرنے یا adjust کرنے کی ضرورت ہے۔ اِن امور کی انجام دہی کے بغیر اور اِس سمت پر کام کیے بغیر امت مسلمہ ایک حقیقت اور ایک قوت نہیں بن سکتی۔ بعض دردِ دل رکھنے والے اصحاب یہ سوال کرتے ہیں کہ کیا اسلامی ممالک کی تنظیم (OIC) کو مسلمانوں کی ایک متحرک' فعال اور مضبوط تنظیم بنا کر اس خواب کی تعبیر نہیں کی جاسکتی؟ یعنی امت مسلمہ ایک حقیقت بن کر دنیا کے سامنے آجائے۔ ہماری رائے میں اس سے یقیناً کسی قدر مقصد حاصل ہوجاتا ہے' لیکن

(باقی صفحہ 94 پر)

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الْاَعْرَاف

آیات ۱۷۹ تا ۱۸۳

وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾ وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ؕ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾ وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۸۱﴾ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۲﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ؕ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿۱۸۳﴾

آیت ۱۷۹ ﴿وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۚ﴾ ’’اور ہم نے جہنّم کے لیے پیدا کیے ہیں بہت سے جن اور انسان۔‘‘

﴿لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ؕ﴾ ’’ان کے دل تو ہیں لیکن ان سے غور نہیں کرتے‘ ان کی آنکھیں ہیں مگر اُن سے دیکھتے نہیں‘ اور ان کے کان ہیں لیکن ان سے سنتے نہیں۔‘‘

﴿اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ﴿۱۷۹﴾﴾ ’’یہ چوپایوں کی مانند ہیں‘ بلکہ ان سے بھی گئے گزرے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو غافل ہیں۔‘‘

یعنی جب انسان ہدایت سے منہ موڑتا ہے اور ہٹ دھرمی پر اتر آتا ہے تو نتیجتاً اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے دلوں پر مہر کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ان کے دل تفقّہ سے یکسر خالی ہو جاتے ہیں‘

اُن کی آنکھیں انسانی آنکھیں نہیں رہتیں اور نہ اُن کے کان انسانی کان رہتے ہیں۔ اب اُن کا دیکھنا حیوانوں جیسا دیکھنا رہ جاتا ہے اور اُن کا سننا حیوانوں جیسا سننا۔ جیسے کُتّا بھی دیکھ لیتا ہے کہ گاڑی آ رہی ہے مجھے اس سے بچنا ہے۔ جبکہ انسانی دیکھنا تو یہ ہے کہ انسان کسی چیز کو دیکھے‘ اس کی حقیقت کو سمجھے اور پھر درست نتائج اخذ کرے۔ اسی فلسفے کو علامہ اقبالؔ نے ان الفاظ میں بیان کیا ہے ؎

اے اہلِ نظر ذوقِ نظر خوب ہے لیکن جو شے کی حقیقت کو نہ دیکھے وہ نظر کیا!

چنانچہ علامہ اقبال کہتے ہیں ع ’’دیدن دگر آموز‘ شنیدن دگر آموز!‘‘ یعنی دوسری طرح کا دیکھنا سیکھو‘ دوسری طرح کا سننا سیکھو! وہ دیکھنا جو دل کی آنکھ سے دیکھا جاتا ہے اور وہ سننا جو دل سے سنا جاتا ہے۔ لیکن جب ان کے دلوں پر اور ان کے کانوں پر مہر ہو گئی اور ان کی آنکھوں پر پردے ڈال دیے گئے تو اب ان کا حال یہ ہے کہ یہ چوپایوں کی مانند ہیں بلکہ ان سے بھی گئے گزرے۔

ایسے لوگوں کو چوپایوں سے بدتر اس لیے کہا گیا ہے کہ چوپایوں کو تو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی کم تر سطح پر کیا ہے‘ جبکہ انسان کا تخلیقی مقام بہت اعلیٰ ہے‘ لیکن جب انسان اس اعلیٰ مقام سے گرتا ہے تو پھر وہ نہ صرف شرفِ انسانیت کو کھو دیتا ہے بلکہ جانوروں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ یہی مضمون ہے جو سورۃ التین میں اس طرح بیان ہوا ہے: ﴿لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْٓ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ ﴿۴﴾ ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ ﴿۵﴾﴾ یعنی انسان کو پیدا کیا گیا بہترین انداز ے پر‘ بلند ترین سطح پر‘ یہاں تک کہ اپنے تخلیقی معیار کے مطابق وہ مسجودِ ملائک ٹھہرا‘ لیکن جب وہ اس مقام سے نیچے گرا تو کم ترین سطح کی مخلوق سے بھی کم ترین ہو گیا۔ پھر اس کی زندگی محض حیوانی زندگی بن کر رہ گئی‘ حیوانوں کی طرح کھایا پیا‘ دنیا کی لذتیں حاصل کیں اور مر گیا۔ نہ زندگی کے مقصد کا ادراک‘ نہ اپنے خالق و مالک کی پہچان‘ نہ اللہ کے سامنے حاضری کا ڈر اور نہ آخرت میں احتساب کی فکر۔ یہ وہ انسانی زندگی ہے جو انسان کے لیے باعث شرم ہے۔ بقولِ سعدی شیرازیؒ ؎

زندگی آمد برائے بندگی زندگی بے بندگی شرمندگی!

آیت ۱۸۰ ﴿وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۪﴾ ’’اور تمام اچھے نام اللہ ہی کے ہیں‘ تو پکارو اُسے اُن (اچھے ناموں) سے۔‘‘

اللہ تعالیٰ کی صفات کے اعتبار سے اس کے بے شمار نام ہیں۔ ان میں سے کچھ قرآن میں

آئے ہیں اور کچھ احادیث میں۔ ایک حدیث جو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے' اس میں حضور اکرم ﷺ نے اللہ تعالیٰ کے ننانوے نام گنوائے ہیں۔ ان ناموں میں ''اللہ'' سب سے بڑا اور اہم ترین نام ہے۔ یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سب نام اچھے ہیں' ان ناموں کے حوالے سے اُس کو پکارا کرو' ان ناموں کے ذریعے سے دعا کیا کرو۔ جیسے یَاسَتَّارُ' یَا غَفَّارُ' یَا کَرِیْمُ' یَا عَلِیْمُ۔ ضمنی طور پر یہاں ایک نکتہ نوٹ کر لیں کہ قرآن مجید میں اللہ کے لیے لفظ ''صفت'' کہیں استعمال نہیں ہوا' البتہ حدیث میں یہ لفظ آیا ہے۔ قرآن میں اللہ کے لیے اس حوالے سے اسماء (نام) کا لفظ ہی استعمال ہوا ہے۔

﴿وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ﴾ ''اور چھوڑ دو ان لوگوں کو جو اس کے ناموں میں کجی نکالتے ہیں۔''

'لحد' کہتے ہیں ٹیڑھ کو۔ 'لحد' بمعنی قبر کا مفہوم یہ ہے کہ قبر کے لیے ایک سیدھا گڑھا کھود کر اس کے اندر ایک بغلی گڑھا کھودا جاتا ہے۔ اس گڑھے کو سیدھے راستے سے ہٹے ہوئے ہونے کی وجہ سے ''لحد'' کہتے ہیں۔ اسمائے الٰہی کے سلسلے میں 'الحاد' ایک تو یہ ہے کہ ان کا غلط استعمال کیا جائے۔ اللہ کے ہر نام کی اپنی تاثیر ہے' اس لحاظ سے مراقبوں وغیرہ کے ذریعے سے اللہ کے ناموں کی تاثیر سے کسی کو کوئی نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے۔ اور دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ کے بعض نام جوڑوں کی شکل میں ہیں' کسی صفت کے دو رُخ ہیں تو اس صفت سے نام بھی دو ہوں گے' جیسے اَلْمُعِزُّ اور اَلْمُذِلُّ' اَلرَّافِعُ اور اَلْخَافِضُ' اَلْحَیُّ اور اَلْمُمِیْتُ وغیرہ۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے جو اسماء اس طرح کے جوڑوں کی شکل میں ہیں ان میں سے اگر ایک ہی نام بار بار پکارا جائے اور دوسرے کو چھوڑ دیا جائے تو یہ بھی الحاد ہوگا۔ مثلاً اَلْمُعِزُّ اور اَلْمُذِلُّ دو نام ایک جوڑے میں ہیں' یعنی وہی عزت دینے والا اور وہی ذلت دینے والا ہے۔ لیکن اگر کوئی شخص یَا مُذِلُّ' یَا مُذِلُّ' یَا مُذِلُّ کا ورد شروع کر دے تو یہ الحاد ہو جائے گا۔ کیونکہ ''اے ذلیل کرنے والے! اے ذلیل کرنے والے!'' مناسب ورد نہیں ہے۔ لہٰذا ایسے تمام نام جب پکارے جائیں تو ہمیشہ جوڑوں ہی کی صورت میں پکارے جائیں۔

﴿سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ ''عنقریب وہ بدلہ پائیں گے اپنے اعمال کا۔''

آیت ۱۸۱ ﴿وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ﴾ ''اور جو انسان ہم نے پیدا کیے ہیں ان میں کچھ لوگ وہ ہیں جو حق کی ہدایت کرتے ہیں اور حق کے ساتھ

عدل کرتے ہیں۔''

یقیناً ہر دور میں کچھ لوگ حق کے علمبردار رہے ہیں اور ایسے لوگ ہمیشہ رہیں گے۔ جیسے حضور ﷺ نے ضمانت دی ہے:

((لَا تَزَالُ طَائِفَةٌ مِنْ اُمَّتِیْ ظَاهِرِيْنَ عَلَى الْحَقِّ))(۱)

''میری اُمت میں ایک گروہ ضرور حق پر قائم رہے گا۔''

آیت ۱۸۲ ﴿وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ﴾ ''رہے وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے' تو ہم رفتہ رفتہ انہیں ایسے پکڑیں گے کہ ان کو پتا بھی نہیں چلے گا۔''

بعض اوقات یوں ہوتا ہے کہ ایک شخص کفر کے راستے پر بڑھتا جاتا ہے تو ساتھ ہی اس کی دنیاوی کامیابیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں' جس کی وجہ سے وہ سمجھتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے' ٹھیک کر رہا ہے اور یہ دُنیاوی کامیابیاں اس کی اسی روش کا ہی نتیجہ ہیں۔ لہٰذا وہ کفر اور معصیت کے راستے میں مزید آگے بڑھتا چلا جاتا ہے۔ یہ کیفیت کسی انسان کے لیے بہت بڑا فتنہ ہے اور اس کو استدراج کہا جاتا ہے۔ یعنی کوئی انسان جو پوری دیدہ دلیری اور ڈھٹائی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی آیات سے اعراض اور اس کے احکام سے نافرمانی کرتا ہے تو اللہ اس کو ڈھیل دیتا ہے اور اس کی رسّی دراز کر دیتا ہے' جس کی وجہ سے وہ گناہوں کی دلدل میں دھنستا چلا جاتا ہے۔

آیت ۱۸۳ ﴿وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ﴾ ''اور میں ان کو ڈھیل دوں گا' یقیناً میری چال بہت مضبوط ہے۔''

ایسے مجرموں کو ڈھیل دینے کی مثال مچھلی کے شکار کی سی ہے۔ جب کانٹا مچھلی کے حلق میں پھنس جائے تو اب وہ کہیں جا نہیں سکتی' جتنی ڈور چاہیں ڈھیلی چھوڑ دیں۔ جب آپ چاہیں گے اسے کھینچ کر قابو کر لیں گے۔

آیات ۱۸۴ تا ۱۸۸

اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى

(۱) صحیح مسلم' کتاب الامارۃ' باب قولہ لا تزال طائفۃ من اُمتی ظاھرین علی الحق.....

اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾ مَنْ
يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ
السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا
هُوَ ؕ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ
حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾ قُلْ
لَّاۤ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ الْغَيْبَ
لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚ اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ
يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾

آیت ۱۸۴ ﴿اَوَلَمْ يَتَفَكَّرُوْا ۗ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ؕ﴾ ''کیا انہوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے ساتھی (محمد ﷺ) کو کوئی جنون نہیں ہے۔''

یعنی رسول اللہ ﷺ پر کسی طرح کے جنون کے اثرات یا کسی جن کا سایہ وغیرہ کچھ نہیں ہے۔ یہ بھی متجسسانہ سوال (searching question) کا انداز ہے کہ ذرا غور کرو' کبھی تم نے سوچا ہے کہ ہمارے رسول ﷺ تمہاری نگاہوں کے سامنے پلے بڑھے ہیں۔ آپ ﷺ کی سیرت' شخصیت' طہارت' نظافت اور آپؐ کا کردار' کیا یہ سب کچھ آپ لوگوں کے سامنے نہیں ہے؟ اس کے باوجود تمہارا اس قدر بھونڈا دعویٰ کہ آپؐ پر جنون کے اثرات ہیں! کبھی تم نے اپنے اس دعوے کے بودے پن پر بھی غور کیا ہے؟

﴿اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۱۸۴﴾﴾ ''وہ نہیں ہیں مگر واضح طور پر خبردار کر دینے والے۔''

آیت ۱۸۵ ﴿اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ﴾ ''اور کیا ان لوگوں نے غور و فکر نہیں کیا آسمانوں اور زمین کی سلطنت میں اور اللہ نے جو چیزیں بنائی ہیں (ان میں)''

﴿وَّاَنْ عَسٰۤى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ﴾ ''اور یہ (نہیں سوچا) کہ ہوسکتا ہے ان کا مقررہ وقت قریب پہنچ گیا ہو۔''

اس سے پہلے اسی سورت میں ہم پڑھ آئے ہیں: ﴿وَلِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۚ﴾ (آیت ۳۴)

''اور ہر قوم کے لیے ایک وقت معیّن ہے''۔ جس کا علم صرف اللہ کو ہے۔ لہٰذا یہ لوگ کیونکر بے فکر ہو سکتے ہیں!

﴿فَبِاَيِّ حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۵﴾﴾ ''اور اب اس کے بعد وہ اور کس بات پر ایمان لائیں گے؟''

آیت ۱۸۶ ﴿مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ؕ﴾ ''جس کو اللہ گمراہ کر دے اسے کوئی ہدایت دینے والا نہیں ہے۔''

جس کی گمراہی پر اللہ کی طرف سے مہرِ تصدیق ثبت ہو جائے' پھر اس کے بعد اسے کوئی راہِ راست پر نہیں لا سکتا۔

﴿وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۸۶﴾﴾ ''اور وہ چھوڑ دے گا ان کو اُن کی سرکشی میں' اندھے ہو کر آگے بڑھتے ہوئے۔''

آیت ۱۸۷ ﴿يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰىهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ﴾ ''(اے نبی ﷺ) یہ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا؟ آپ کہیے کہ اس کا علم تو میرے ربّ ہی کے پاس ہے۔''

یہ لوگ آپ ﷺ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ کب لنگر انداز ہوگی؟ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اس کے بارے میں سوائے میرے اللہ کے کوئی نہیں جانتا۔ کسی کے پاس اس بارے میں کوئی علم نہیں ہے۔ ''مُرْسٰی'' جہاز کے لنگر انداز ہونے کو کہا جاتا ہے۔ جیسے ''بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا''

﴿لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ﴾ ''وہی ظاہر کرے گا اسے اس کے وقت پر۔''

﴿ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ﴾ ''وہ آسمانوں اور زمین کے اندر بڑا بھاری بوجھ ہے۔''

آسمان و زمین اس سے بوجھل ہیں۔ جیسے ایک مادہ اپنا حمل لیے پھرتی ہے' اسی طرح یہ کائنات بھی قیامت کو یعنی اپنی فنا کو لیے لیے پھرتی ہے۔ ہر شے جو تخلیق کی گئی ہے اس کی ایک ''اجلِ مسمّٰی'' اس کے اندر موجود ہے۔ گویا ہر مخلوق کی موت اس کے وجود کے اندر سمو دی گئی ہے۔ چنانچہ ہر انسان اپنی موت کو ساتھ ساتھ لیے پھر رہا ہے اور اسی لحاظ سے پوری کائنات بھی۔

﴿لَا تَاْتِیْکُمْ اِلَّا بَغْتَۃً ؕ﴾ ’’وہ نہیں آئے گی تم پر مگر اچانک۔‘‘

﴿یَسْـَٔلُوْنَکَ کَاَنَّکَ حَفِیٌّ عَنْہَا ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ) آپ سے تو یہ اس طرح پوچھتے ہیں گویا آپ اس کی کھوج میں لگے ہوئے ہیں۔‘‘

آپ ﷺ سے تو وہ ایسے پوچھتے ہیں جیسے سمجھتے ہوں کہ آپ کو تو بس قیامت کی تاریخ ہی کے بارے میں فکر دامن گیر ہے اور آپ اس کی تحقیق و جستجو میں لگے ہوئے ہیں۔ حالانکہ آپ کا اس سے کوئی سروکار نہیں، یہ تو ہمارا معاملہ ہے۔

﴿قُلْ اِنَّمَا عِلْمُہَا عِنْدَ اللّٰہِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸۷﴾﴾ ’’آپ کہہ دیجیے کہ اس کا علم تو بس اللہ ہی کے پاس ہے، لیکن اکثر لوگ علم نہیں رکھتے۔‘‘

آیت ۱۸۸ ﴿قُلْ لَّآ اَمْلِکُ لِنَفْسِیْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰہُ ؕ﴾ ’’کہہ دیجیے کہ مجھے کوئی اختیار نہیں ہے اپنی جان کے بارے میں بھی کسی نفع کا اور نہ کسی نقصان کا، سوائے اس کے جو اللہ چاہے۔‘‘

آپ ﷺ انہیں بتائیں کہ میرے پاس علمِ غیب نہیں ہے۔ جیسا کہ سورۃ الانعام کی آیت ۵۰ میں فرمایا گیا کہ اے نبی ﷺ کہہ دیجیے کہ میں نہ تم سے یہ کہتا ہوں کہ اللہ کے خزانے میرے قبضۂ قدرت میں ہیں، نہ میں علمِ غیب جانتا ہوں اور نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔

﴿وَلَوْ کُنْتُ اَعْلَمُ الْغَیْبَ لَاسْتَکْثَرْتُ مِنَ الْخَیْرِ ۚۖ وَمَا مَسَّنِیَ السُّوْٓءُ ۚ﴾ ’’اور اگر مجھے علمِ غیب حاصل ہوتا تو میں بہت سا خیر جمع کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی تکلیف نہ آتی۔‘‘

﴿اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِیْرٌ وَّبَشِیْرٌ لِّقَوْمٍ یُّؤْمِنُوْنَ ﴿۱۸۸﴾﴾ ’’نہیں ہوں میں مگر بشارت دینے والا اور خبردار کرنے والا، ان لوگوں کے لیے جو ایمان والے ہوں۔‘‘

آیات ۱۸۹ تا ۲۰۲

هُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنْہَا زَوْجَہَا لِیَسْکُنَ اِلَیْہَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىہَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِہٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰہَ رَبَّہُمَا لَئِنْ اٰتَیْتَنَا صَالِحًا لَّنَکُوْنَنَّ مِنَ الشّٰکِرِیْنَ ﴿۱۸۹﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىہُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَہٗ شُرَکَآءَ فِیْمَآ اٰتٰىہُمَا ۚ فَتَعٰلَی اللّٰہُ عَمَّا یُشْرِکُوْنَ ﴿۱۹۰﴾

اَیُشْرِکُوْنَ مَا لَا یَخْلُقُ شَیْـًٔا وَّہُمْ یُخْلَقُوْنَ ﴿۱۹۱﴾ۡ وَلَا یَسْتَطِیْعُوْنَ لَہُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَہُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۲﴾ وَاِنْ تَدْعُوْہُمْ اِلَی الْہُدٰی لَا یَتَّبِعُوْکُمْ ؕ سَوَآءٌ عَلَیْکُمْ اَدَعَوْتُمُوْہُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿۱۹۳﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ عِبَادٌ اَمْثَالُکُمْ فَادْعُوْہُمْ فَلْیَسْتَجِیْبُوْا لَکُمْ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۹۴﴾ اَلَہُمْ اَرْجُلٌ یَّمْشُوْنَ بِہَآ ۫ اَمْ لَہُمْ اَیْدٍ یَّبْطِشُوْنَ بِہَآ ۫ اَمْ لَہُمْ اَعْیُنٌ یُّبْصِرُوْنَ بِہَآ ۫ اَمْ لَہُمْ اٰذَانٌ یَّسْمَعُوْنَ بِہَا ؕ قُلِ ادْعُوْا شُرَکَآءَکُمْ ثُمَّ کِیْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۱۹۵﴾ اِنَّ وَلِیِّۦَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ ۫ۖ وَہُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ ﴿۱۹۶﴾ وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَکُمْ وَلَآ اَنْفُسَہُمْ یَنْصُرُوْنَ ﴿۱۹۷﴾ وَاِنْ تَدْعُوْہُمْ اِلَی الْہُدٰی لَا یَسْمَعُوْا ؕ وَتَرٰىہُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَہُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ ﴿۱۹۸﴾ خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰہِلِیْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ ﴿۲۰۰﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّہُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا فَاِذَا ہُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ۚ وَاِخْوَانُہُمْ یَمُدُّوْنَہُمْ فِی الْغَیِّ ثُمَّ لَا یُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

آیت ۱۸۹ ﴿ہُوَ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَۃٍ وَّجَعَلَ مِنْہَا زَوْجَہَا لِیَسْکُنَ اِلَیْہَا ۚ﴾ ’’وہی ہے جس نے تمہیں پیدا کیا ایک جان سے اور اسی سے بنایا اس کا جوڑا، تاکہ وہ اس کے پاس سکون حاصل کرے۔‘‘

اس نکتے کی وضاحت سورۃ البقرۃ کی آیت ۱۸۷ ﴿وَابْتَغُوْا مَا کَتَبَ اللّٰہُ لَکُمْ ۠﴾ کے مطالعے کے دوران گزر چکی ہے۔ شوہر اور بیوی کے تعلقات میں جہاں اولاد کا معاملہ ہے وہاں تسکین اور سکون کا پہلو بھی ہے۔

﴿فَلَمَّا تَغَشّٰىہَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِیْفًا فَمَرَّتْ بِہٖ ۚ﴾ ’’تو جب وہ (شوہر) ڈھانپ لیتا ہے اس (اپنی بیوی) کو تو اسے حمل ہو جاتا ہے ہلکا سا حمل، تو وہ اس کے ساتھ چلتی پھرتی رہتی ہے۔‘‘

ابتدا میں حمل اتنا خفیف ہوتا ہے کہ پتا بھی نہیں چلتا کہ کوئی حمل ٹھہر گیا ہے۔

﴿فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ۝۱۸۹﴾ ''پھر جب بوجھل ہو جاتی ہے تو وہ دونوں اپنے رب کو پکارتے ہیں' کہ اگر تو ہمیں صحیح سالم بچہ عطا کر دے گا تو ہم تیرے شکر گزاروں میں سے ہوں گے۔''

آیت ۱۹۰ ﴿فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ اٰتٰىهُمَا ۚ﴾ ''پھر جب اللہ نے انہیں عطا کر دیا صحیح سالم بچہ' تو ٹھہرا لیے انہوں نے اس کے شریک اس میں جو اللہ نے ان کو عطا کیا تھا۔''

کہ ہم فلاں بزرگ کے مزار پر گئے تھے' ان کی نگاہِ کرم ہوئی ہے' یا فلاں دیوی یا دیوتا کی کرپا کی وجہ سے ہمیں اولاد مل گئی ہے۔

﴿فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ۝۱۹۰﴾ ''اللہ بہت بلند و بالا ہے ان کے اس شرک سے۔''

آیت ۱۹۱ ﴿اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ شَيْـًٔا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ۝۱۹۱﴾ ''کیا وہ ان کو شریک کر رہے ہیں (اللہ کے ساتھ) جو کوئی شے تخلیق کرتے ہی نہیں بلکہ وہ خود مخلوق ہیں۔''

فرشتے' جنّات' انبیاء اور اولیاء اللہ سب کے سب خود اللہ کی مخلوق ہیں۔

آیت ۱۹۲ ﴿وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ يَنْصُرُوْنَ۝۱۹۲﴾ ''اور نہ وہ ان کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ وہ اپنی مدد پر قادر ہیں۔''

وہ تو سب کے سب خود اللہ کے بندے ہیں۔ اب یہاں بات تدریجاً بُتوں کی طرف لائی جا رہی ہے۔ نظریاتی طور پر تو ان کے فلسفی بُت پرستی کا جواز یہ بتاتے ہیں کہ وہ ان پتھر کے بُتوں کی پوجا نہیں کرتے بلکہ ان مورتیوں کی حیثیت علامتی ہے۔ اصل دیوتا اور دیویاں چونکہ ہمارے سامنے موجود نہیں ہیں اس لیے ان کے بارے میں توجہ کے ارتکاز کے لیے ہم بتوں کو علامت کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ یہ اس فلسفہ کا خلاصہ ہے جو انڈیا کے ڈاکٹر رادھا کرشنن وغیرہ بیان کرتے رہے ہیں' مگر ان کے عوام تو ان بُتوں ہی کو معبود مانتے ہیں' ان ہی کی پوجا کرتے ہیں' بتوں ہی کے آگے جھکتے ہیں' نذرانے دیتے ہیں اور انہی سے اپنی حاجات مانگتے ہیں۔

آیت ۱۹۳ ﴿وَاِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۭ﴾ ''اور اگر تم انہیں پکارو راہنمائی کے لیے (کہ تمہیں راستہ دکھا دیں) تو وہ تمہاری طرف توجہ ہی نہیں کر سکیں گے۔''

﴿سَوَآءٌ عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ۝۱۹۳﴾ ''برابر ہے تمہارے لیے کہ تم انہیں پکارو یا خاموش رہو۔''

آیت ۱۹۴ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ عِبَادٌ اَمْثَالُكُمْ﴾ ''یقیناً جنہیں تم پکارتے ہو اللہ کے ماسوا وہ بھی تمہاری طرح کے بندے ہیں''

وہ فرشتے ہوں یا جِنّات' دیوی دیوتا ہوں یا اولیاء اللہ' سب تمہاری طرح اللہ ہی کے بندے ہیں۔

﴿فَادْعُوْهُمْ فَلْيَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ۝۱۹۴﴾ ''ان کو پکار دیکھو' پھر وہ تمہیں جواب دیں اگر تم سچے ہو۔''

اگر تم اپنے اس دعوے میں سچے ہو کہ وہ لائقِ پرستش ہیں اور کچھ اختیار بھی رکھتے ہیں تو تمہاری پکار یا دعا پر ان کی طرف سے کچھ نہ کچھ جواب تو ضرور ملنا چاہیے۔ بلکہ سورۂ یونس میں تو یہاں تک واضح کیا گیا ہے کہ روزِ محشر وہ کہیں گے کہ ہمیں تو خبر ہی نہیں تھی کہ تم لوگ ہماری پوجا پاٹ کرتے رہے ہو: ﴿اِنْ كُنَّا عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغٰفِلِيْنَ۝۲۹﴾ یعنی ہم تو اس سب کچھ سے غافل تھے کہ تم لوگ ہمیں پکارتے رہے ہو' ہماری دہائیاں دیتے رہے ہو۔ ''یا شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً لِلّٰہ'' جیسے مشرکانہ ورد کرتے رہے ہو۔ اب اگلی آیت میں خاص طور پر بُتوں کی طرف اشارہ ہے۔

آیت ۱۹۵ ﴿اَلَهُمْ اَرْجُلٌ يَّمْشُوْنَ بِهَآ﴾ ''کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے یہ چلتے ہوں؟''

تم نے ان کے پاؤں اگر بنا بھی دیے ہیں تو کیا وہ ایک قدم چلنے کی سکت بھی رکھتے ہیں؟

﴿اَمْ لَهُمْ اَيْدٍ يَّبْطِشُوْنَ بِهَآ﴾ ''یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے یہ پکڑتے ہوں؟''

﴿اَمْ لَهُمْ اَعْيُنٌ يُّبْصِرُوْنَ بِهَآ﴾ ''یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے یہ دیکھتے ہوں؟''

﴿اَمْ لَهُمْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ﴾ ''یا ان کے کان ہیں جن سے یہ سنتے ہوں؟''

﴿قُلِ ادْعُوْا شُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ كِيْدُوْنِ فَلَا تُنْظِرُوْنِ۝۱۹۵﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ کہہ دیجیے کہ پکار لو اپنے سب شریکوں کو' پھر میرے خلاف چالیں چلو (جو چل سکتے ہو) اور مجھے کوئی مہلت نہ دو۔''

رسول اللہ ﷺ سے ڈنکے کی چوٹ یہ اعلان کرایا جا رہا ہے کہ میں تم سے کوئی درخواست

نہیں کرتا کہ میرے ساتھ نرمی کرو یا مجھے مہلت دے دو۔ تم اپنے تمام معبودوں کو بلا لو اور میرے خلاف جو بھی اقدام کر سکتے ہو کر گزرو۔ یہ اسی طرح کا قولِ فیصل ہے جیسے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اعلانِ براءت کرایا گیا تھا: ﴿اِنَّنِیْ بَرِیْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِکُوْنَ﴾ (الانعام)۔

آیت ۱۹۶ ﴿اِنَّ وَلِیِّیَ اللّٰہُ الَّذِیْ نَزَّلَ الْکِتٰبَ ۚ وَھُوَ یَتَوَلَّی الصّٰلِحِیْنَ﴾ ''یقیناً میرا مددگار تو وہ اللہ ہے جس نے یہ کتاب نازل کی' اور صالح بندوں کا وہی پشت پناہ ہے۔''

آیت ۱۹۷ ﴿وَالَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِہٖ لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ نَصْرَکُمْ وَلَآ اَنْفُسَھُمْ یَنْصُرُوْنَ﴾ ''اور جنہیں تم پکار رہے ہو اُس (اللہ) کو چھوڑ کر وہ تمہاری مدد کی استطاعت ہی نہیں رکھتے' اور نہ وہ خود اپنی مدد کر سکتے ہیں۔''

آیت ۱۹۸ ﴿وَاِنْ تَدْعُوْھُمْ اِلَی الْھُدٰی لَا یَسْمَعُوْا ؕ﴾ ''اور اگر تم انہیں راہنمائی کے لیے پکارو تو وہ سن نہ سکیں گے۔''

﴿وَتَرٰىھُمْ یَنْظُرُوْنَ اِلَیْکَ وَھُمْ لَا یُبْصِرُوْنَ﴾ ''اور تمہیں ایسا نظر آتا ہے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں جب کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتے۔''

آیت ۱۹۹ ﴿خُذِ الْعَفْوَ وَاْمُرْ بِالْعُرْفِ﴾ ''(اے نبی ﷺ!) آپ درگزر کو تھام لیجیے اور بھلی بات کا حکم دیتے رہیے''

جیسا کہ مکّی سورتوں کے آخر میں اکثر حضور ﷺ سے خطاب اور التفات ہوتا ہے یہاں بھی وہی انداز ہے کہ آپؐ ان لوگوں سے بہت زیادہ بحث مباحثہ میں نہ پڑیں' ان کے رویے سے درگزر کریں اور اپنی دعوت جاری رکھیں۔

﴿وَاَعْرِضْ عَنِ الْجٰھِلِیْنَ﴾ ''اور جاہلوں سے اعراض کریں۔''

یہ جاہل لوگ آپؐ سے الجھنا چاہیں تو آپؐ ان سے کنارہ کشی کر لیں۔ جیسا کہ سورۃ الفرقان میں فرمایا: ﴿وَاِذَا خَاطَبَھُمُ الْجٰھِلُوْنَ قَالُوْا سَلٰمًا﴾ ''اور جب جاہل لوگ ان (رحمٰن کے بندوں) سے الجھنا چاہتے ہیں تو وہ ان کو سلام کہتے (ہوئے گزر جاتے) ہیں''۔ سورۃ القصص میں بھی اہلِ ایمان کا یہی طریقہ بیان کیا گیا ہے: ﴿سَلٰمٌ عَلَیْکُمْ ۫ لَا نَبْتَغِی الْجٰھِلِیْنَ﴾ ''تمہیں سلام ہو' ہم جاہلوں کے منہ نہیں لگنا چاہتے''۔ آیت زیرِ نظر میں ایک داعی کے لیے تین بڑی بنیادی باتیں بتائی گئی ہیں۔ عفو درگزر سے کام لینا' نیکی اور بھلائی کی بات کا حکم دیتے رہنا' اور جاہل یعنی جذباتی اور مشتعل مزاج لوگوں سے اعراض کرنا۔

آیت ۲۰۰ ﴿وَاِمَّا یَنْزَغَنَّکَ مِنَ الشَّیْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰہِ ؕ اِنَّہٗ سَمِیْعٌ عَلِیْمٌ﴾ ''اور اگر کبھی آپ کو کوئی چوک لگ ہی جائے شیطان کی طرف سے تو اللہ کی پناہ طلب کریں' یقیناً وہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔''

نزع اور نزغ ملتے جلتے حروف والے دو مادے ہیں' ان میں صرف ''ع'' اور ''غ'' کا فرق ہے۔ نزع کھینچنے کے معنی دیتا ہے جبکہ نزغ کے معنی ہیں کچوکا لگانا' اکسانا' وسوسہ اندازی کرنا۔ یعنی اگر بر بنائے طبع بشری کبھی جذبات میں اشتعال اور غصہ آ ہی جائے تو فوراً بھانپ لیں کہ یہ شیطان کی جانب سے ایک چوک ہے' چنانچہ فوراً اللہ کی پناہ مانگیں۔ جیسا کہ غزوۂ اُحد میں حضور ﷺ کو غصہ آ گیا تھا اور آپؐ کی زبان مبارک سے ایسے الفاظ نکل گئے تھے: ((کَیْفَ یُفْلِحُ قَوْمٌ خَضَبُوْا وَجْہَ نَبِیِّھِمْ بِالدَّمِ وَھُوَ یَدْعُوْھُمْ اِلَی اللّٰہِ))(۱) ''یہ قوم کیسے فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کے چہرے کو خون سے رنگ دیا جبکہ وہ انہیں اللہ کی طرف بلا رہا تھا!''

یہ آیت آگے چل کر سورۂ حٰمٓ السجدۃ میں ایک لفظ (ھُوَ) کے اضافے کے ساتھ دوبارہ آئے گی: ﴿اِنَّہٗ ھُوَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ﴾ کہ یقیناً وہی ہے سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا۔

آیت ۲۰۱ ﴿اِنَّ الَّذِیْنَ اتَّقَوْا اِذَا مَسَّھُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّیْطٰنِ تَذَکَّرُوْا﴾ ''جن لوگوں کے اندر تقویٰ ہے ان کو جب کوئی برا خیال چھو جاتا ہے شیطان کے اثر سے تو وہ چوکنے ہو جاتے ہیں''

یعنی جن کے دلوں میں اللہ کا تقویٰ جاگزیں ہوتا ہے وہ ہر گھڑی اپنے فکر و عمل کا احتساب کرتے رہتے ہیں اور اگر کبھی عارضی طور پر غفلت یا شیطانی وسوسوں سے کوئی منفی اثرات دل و دماغ میں ظاہر ہوں تو وہ فوراً سنبھل کر اللہ کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ جیسے خود نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ((اِنَّہٗ لَیُغَانُ عَلٰی قَلْبِیْ وَاِنِّیْ لَاَسْتَغْفِرُ اللّٰہَ فِی الْیَوْمِ مِائَۃَ مَرَّۃٍ))(۲) ''میرے دل پر

(۱) سنن ابن ماجہ' کتاب الفتن' باب الصبر علی البلاء۔ ومسند احمد: ۱۲۷۲۵۔ یہ حدیث صحیح مسلم اور سنن الترمذی میں بھی قدرے مختلف الفاظ کے ساتھ وارد ہوئی ہے۔

(۲) صحیح مسلم' کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار' باب استحباب الاستغفار والاستکثار منہ۔ وسنن ابی داؤد' کتاب الصلاۃ' باب فی الاستغفار۔

بھی کبھی حجاب سا آ جاتا ہے اور میں روزانہ سو سو مرتبہ اللہ سے مغفرت طلب کرتا ہوں‘‘۔ لیکن یہ سمجھ لیجیے کہ ہمارے دل پر حجاب اور شے ہے جبکہ رسول اللہ ﷺ کے قلبِ مبارک پر حجاب بالکل اور شے ہے۔ یہ حجاب بھی اُس حضوری کے درجے میں ہوگا جو ہماری لاکھوں حضوریوں سے بڑھ کر ہے۔ یہاں صرف بات کی وضاحت کے لیے اس حدیث کا ذکر کیا گیا ہے ورنہ جس حجاب کا ذکر حضور ﷺ نے فرمایا ہے ہم نہ تو اس کا اندازہ کر سکتے ہیں کہ اس کی نوعیت کیا ہوگی اور نہ ہی اس کی مشابہت ہماری کسی بھی قسم کی قلبی کیفیات کے ساتھ ہو سکتی ہے۔ ہم نہ تو حضور ﷺ کے تعلق مع اللہ کی کیفیت کا تصور کر سکتے ہیں اور نہ ہی مذکورہ حجاب کی کیفیت کا۔ بس اس تعلق مع اللہ کی شدت (intensity) میں کبھی ذرا سی بھی کمی آ گئی تو حضور ﷺ نے اسے حجاب سے تعبیر فرمایا۔

﴿فَاِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾﴾ ’’اور دفعۃً ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔‘‘

جب وہ چوکنے ہو جاتے ہیں تو ان کی وقتی غفلت دور ہو جاتی ہے‘ عارضی منفی اثرات کا بوجھ ختم ہو جاتا ہے اور حقائق پھر سے واضح نظر آنے لگتے ہیں۔

آیت ۲۰۲ ﴿وَاِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾﴾ ’’اور جو اُن (شیطانوں) کے بھائی ہیں انہیں وہ گھسیٹ کر لے جاتے ہیں دور تک گمراہی میں‘ پھر وہ کچھ کمی نہیں کرتے۔‘‘

شیطان کا جو دوست بنے گا پھر اس پر شیطان کا حکم تو چلے گا۔ شیاطین اپنے بھائی بندوں کو گمراہی میں گھسیٹتے ہوئے دور تک لے جاتے ہیں اور اس میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتے۔ یعنی گمراہی کی آخری حد تک پہنچا کر رہتے ہیں۔ جیسے بلعم بن باعوراء کو شیطان نے اپنا شکار بنایا تھا اور اسے گمراہی کی آخری حد تک پہنچا کر دم لیا‘ لیکن جو اللہ کے مخلص اور متقی بندے ہیں ان پر شیطان کا اختیار نہیں چلتا۔ ان کی کیفیت وہ ہوتی ہے جو اس سے پچھلی آیت میں بیان ہوئی ہے‘ یعنی جونہی منفی اثرات کا سایہ ان کو اپنی طرف بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے وہ یکدم چونک کر اللہ کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔

آیات ۲۰۳ تا ۲۰۶

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ

فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ﴿۲۰۵﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ﴿۲۰۶﴾ ع

آخر میں ان دونوں سورتوں کے مضامین کے عمود کا خلاصہ بیان کیا جا رہا ہے۔ جس زمانے میں یہ دو سورتیں نازل ہوئیں اس وقت کفارِ مکّہ کی طرف سے یہ مطالبہ تکرار کے ساتھ کیا جا رہا تھا کہ کوئی نشانی لاؤ‘ کوئی معجزہ دکھاؤ۔ جس طرح کے حسّی معجزات حضرت عیسیٰ اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کو ملے تھے‘ اسی نوعیت کے معجزات اہلِ مکہ بھی دیکھنا چاہتے تھے۔ جیسے جیسے اُن کی طرف سے مطالبات آتے رہے‘ ساتھ ساتھ ان کے جوابات بھی دیے جاتے رہے۔ اب اس سلسلے میں آخری بات ہو رہی ہے۔

آیت ۲۰۳ ﴿وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ؕ﴾ ’’(اے نبی ﷺ) جب آپ ان کے پاس کوئی معجزہ نہیں لاتے تو یہ کہتے ہیں کہ آپ کیوں نہ اسے چُن کر لے آئے؟‘‘

کُفّارِ مکّہ کا کہنا تھا کہ جب آپ (ﷺ) کا دعویٰ ہے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں‘ اُس کے محبوب ہیں تو آپ کے لیے معجزہ دکھانا کون سا مشکل کام ہے؟ آپ ہمارے اطمینان کے لیے کوئی معجزہ چھانٹ کر لے آئیں! اس سلسلے میں تفسیر کبیر میں امام رازیؒ نے ایک واقعہ نقل کیا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کا ایک پھوپھی زاد بھائی تھا‘ جو اگرچہ ایمان تو نہیں لایا تھا مگر اکثر آپ ﷺ کے ساتھ رہتا اور آپ ﷺ سے تعاون بھی کرتا تھا۔ اس کے اس طرح کے رویّے سے امید تھی کہ ایک دن وہ ایمان بھی لے آئے گا۔ ایک دفعہ کسی محفل میں سردارانِ قریش نے معجزات کے بارے میں آپ ﷺ سے بہت بحث و تکرار کی کہ آپ نبی ہیں تو ابھی معجزہ دکھائیں‘ یہ نہیں تو وہ دکھا دیں‘ ایسے نہیں تو ویسے کر کے دکھا دیں! (اس کی تفصیل سورۂ بنی اسرائیل میں بھی آئے گی) مگر آپ ﷺ نے ان کی ہر بات پر یہی فرمایا کہ معجزہ دکھانا میرے اختیار میں نہیں ہے‘ یہ تو اللہ کا فیصلہ ہے‘ جب اللہ تعالیٰ چاہے گا دکھا دے گا۔ اس پر انہوں نے گویا اپنے زعم میں میدان مار لیا اور آپ ﷺ پر آخری حجت قائم کر دی۔ اس کے بعد جب حضور ﷺ وہاں سے اٹھے تو وہاں شور مچ گیا۔ ان لوگوں نے کیا کیا اور کس کس انداز میں باتیں نہیں کی ہوں گی اور اس کے عوام پر کیا اثرات ہوئے ہوں گے۔ اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ آپ ﷺ کے اُس

پھوپھی زاد بھائی نے کہا کہ آج تو گویا آپ کی قوم نے آپ پر حجت قائم کر دی ہے' اب میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔

اس واقعہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ یہ موضوع اس ماحول میں کس قدر اہمیت اختیار کر گیا تھا اور اس طرح کی صورتِ حال میں آپ ﷺ کس قدر دل گرفتہ ہوئے ہوں گے۔ اس کا کچھ نقشہ سورۃ الانعام آیت ۳۵ میں اس طرح کھینچا گیا ہے: ﴿وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ؕ﴾ ''اور (اے نبی ﷺ) اگر آپ پر بہت شاق گزر رہا ہے ان کا اعراض تو اگر آپ میں طاقت ہے تو زمین میں کوئی سرنگ بنا لیجیے یا آسمان پر سیڑھی لگا لیجیے اور ان کے لیے کہیں سے کوئی نشانی لے آیئے!'' (ہم تو نہیں دکھائیں گے!)۔ یہ پس منظر ہے ان حالات کا جس میں فرمایا جا رہا ہے کہ معجزات کے مطالبات میں آپ ﷺ ان کو بتائیں کہ معجزہ دکھانے یا نہ دکھانے کا فیصلہ اللہ نے کرنا ہے' مجھے اس کا اختیار نہیں ہے۔

﴿قُلْ اِنَّمَآ اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ﴾ ''کہہ دیجیے کہ میں تو صرف پیروی کر رہا ہوں اُس کی جو میری طرف وحی کی جا رہی ہے میرے ربّ کی طرف سے۔''

﴿هٰذَا بَصَآئِرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿۲۰۳﴾﴾ ''یہ تمہارے ربّ کی طرف سے بصیرت افروز باتیں ہیں' اور یہ ہدایت اور رحمت ہے ان لوگوں کے حق میں جو ایمان لے آئیں۔''

میں آپ لوگوں کے سامنے جو پیش کر رہا ہوں' یہ وہی کچھ ہے جو اللہ نے مجھ پر وحی کیا ہے اور میں خود بھی اسی کی پیروی کر رہا ہوں۔ اس سے بڑھ کر میں نے کبھی کوئی دعویٰ کیا ہی نہیں۔

آیت ۲۰۴ ﴿وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۲۰۴﴾﴾ ''اور جب قرآن پڑھا جا رہا ہو تو اسے پوری توجہ کے ساتھ سنا کرو اور خاموش رہا کرو تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔''

سَمِعَ' يَسْمَعُ کے معنی ہیں سننا' جبکہ اِستِمَاع کے معنی ہیں پوری توجہ کے ساتھ سننا' کان لگا کر سننا۔ جو حضرات جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قراءت نہ کرنے کے قائل ہیں وہ اسی آیت کو بطور دلیل پیش کرتے ہیں' کیونکہ اس آیت کی رو سے تلاوتِ قرآن کو پوری طرح ارتکازِ توجہ کے ساتھ سننا فرض ہے اور ساتھ ہی خاموش رہنے کا حکم بھی ہے۔ جبکہ نماز کے دوران

خود تلاوت کرنے کی صورت میں سننے کی طرف توجہ نہیں رہے گی اور خاموش رہنے کے حکم پر بھی عمل نہیں ہوگا۔

آیت ۲۰۵ ﴿وَاذْكُرْ رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً﴾ ''اور اپنے رب کو یاد کرتے رہا کرو اپنے جی ہی جی میں' عاجزی اور خوف کے ساتھ''

اس عاجزی کی انتہا اور عبدیت کاملہ کا مظہر تو وہ دعائے ماثور ہے جو میں نے نقل کی ہے ''مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق'' نامی اپنے کتابچے کے آخر میں۔ ان دونوں آیات (قرآن کی عظمت اور دعا میں عاجزی) کے حوالے سے اس دعا کے مندرجہ ذیل الفاظ کو اپنے قلب کی گہرائیوں میں اتارنے کی کوشش کریں:

اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ عَبْدُكَ ''اے اللہ میں تیرا بندہ ہوں!''

وَابْنُ عَبْدِكَ وَابْنُ اَمَتِكَ ''تیرے ایک ناچیز غلام اور ادنیٰ کنیز کا بیٹا ہوں!''

وَفِيْ قَبْضَتِكَ ' نَاصِيَتِيْ بِيَدِكَ ''اور مجھ پر تیرا ہی کامل اختیار ہے' میری پیشانی تیرے ہی ہاتھ ہے۔''

مَاضٍ فِيَّ حُكْمُكَ ' عَدْلٌ فِيَّ قَضَاءُكَ ''نافذ ہے میرے بارے میں تیرا ہر حکم' اور عدل ہے میرے بارے میں تیرا ہر فیصلہ۔''

اَسْئَلُكَ بِكُلِّ اسْمٍ هُوَ لَكَ' سَمَّيْتَ بِهٖ نَفْسَكَ ''میں تجھ سے درخواست کرتا ہوں تیرے ہر اُس اسم کے واسطے سے جس سے تو نے اپنی ذاتِ مقدس کو موسوم فرمایا''

اَوْ اَنْزَلْتَهٗ فِيْ كِتَابِكَ ''یا اپنی کسی کتاب میں نازل فرمایا''

اَوْ عَلَّمْتَهٗ اَحَدًا مِنْ خَلْقِكَ ''یا اپنی مخلوق میں سے کسی کو تلقین فرمایا''

اَوِ اسْتَاْثَرْتَ بِهٖ فِيْ مَكْنُوْنِ الْغَيْبِ عِنْدَكَ ''یا اسے اپنے مخصوص خزانہ غیب ہی میں محفوظ رکھا''

اَنْ تَجْعَلَ الْقُرْاٰنَ رَبِيْعَ قَلْبِيْ وَ نُوْرَ صَدْرِيْ وَجِلَاءَ حُزْنِيْ وَ ذَهَابَ هَمِّيْ وَ غَمِّيْ(۱) ''کہ تو بنا دے قرآن مجید کو میرے دل کی بہار اور میرے سینے کا نور اور میرے رنج و حزن کی جلا اور میرے تفکّرات اور غموں کے ازالے کا سبب!''

آمِيْن يَا رَبَّ الْعَالَمِيْنَ! ''ایسا ہی ہوا ے تمام جہانوں کے پروردگار!''

(۱) رواہ احمد ورزین ۔ مشکاۃ المصابیح' کتاب الدعوات' باب الدعوات فی الاوقات' الفصل الثالث ۔ عن عبداللہ بن مسعود ؓ۔

﴿وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ﴾ ''اور بلند آواز سے نہیں (پست آواز سے)''

البتہ جب آدمی دُعا مانگے تو اس طرح مانگے کہ خود سن سکے تاکہ اس کی سماعت بھی اس سے استفادہ کرے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص اکیلا نماز پڑھ رہا ہو تو قراءت ایسے کرے کہ خود سن سکے' اگرچہ سرّی نماز ہی کیوں نہ ہو۔

﴿بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ﴾ ''(اور اس طرح آپ اپنے رب کا ذکر کرتے رہیں) صبح کے وقت بھی اور شام کے اوقات میں بھی''

جیسے سورۃ الانعام کی پہلی آیت کی تشریح کے ضمن میں ذکر آیا تھا کہ لفظ نُور قرآن میں ہمیشہ واحد آتا ہے جبکہ **ظُلُمات** ہمیشہ جمع ہی آتا ہے' اسی طرح لفظ **غُدُوّ** (صبح) بھی ہمیشہ واحد اور آصال (شام) ہمیشہ جمع ہی آتا ہے۔ یہ اَصِیل کی جمع ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ صبح کی نماز تو ایک ہی ہے یعنی فجر' جبکہ سورج ذرا مغرب کی طرف ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو پے در پے نمازیں ہیں' جو رات تک پڑھی جاتی رہتی ہیں یعنی ظہر' عصر' مغرب اور عشاء۔ سورۂ بنی اسرائیل کی آیت ۷۸ ﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ﴾ میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔

﴿وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝۲۰۵﴾ ''اور غافلوں میں سے نہ ہو جایئے۔''

آیت ۲۰۶ ﴿اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ رَبِّكَ﴾ ''بے شک وہ جو آپ کے ربّ کے پاس ہیں''

یعنی ملأ اعلیٰ جو ملائکہ مقرّبین پر مشتمل ہے' جس کا نقشہ امیر خسروؒ نے اپنے اس خوبصورت شعر میں اس طرح بیان کیا ہے:

خدا خود میرِ محفل بود اندر لامکاں خسرو   محمدؐ شمعِ محفل بود شب جائے کہ من بودم!

یعنی لامکاں کی وہ محفل جس کا میر محفل خود اللہ تعالیٰ ہے اور جہاں شرکائے محفل ملائکہ مقرّبین ہیں اور محمدٌ رسول اللہ ﷺ (روحِ محمدیؐ) کو اس محفل میں گویا چراغ اور شمع کی حیثیت حاصل ہے۔ امیر خسرو کہتے ہیں کہ رات مجھے بھی اس محفل میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔

﴿لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۝۲۰۶﴾ ''وہ اس کی عبادت سے استکبار نہیں کرتے' اور اُس کی تسبیح کرتے رہتے ہیں' اور اُس کے لیے سجدے کرتے رہتے ہیں۔''

[تمّت سُورۃ الاعراف]

بارك الله لی ولكم فی القرآن العظیم ۔ ونفعنی وایاكم بالآیات والذكر الحكیم○○

مَحبّتِ الٰہی کا حقیقی معیار

عتیق الرحمٰن صدیقی

محبّت: انبیاء کی تعلیم کا مرکز

مولانا حمید الدین فراہیؒ سورۃ الاخلاص کی تفسیر بیان کرتے ہوئے ''محبت'' کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ:

''جس طرح ہر ایک کام کی ایک غرض اور انتہا ہوتی ہے جس پر وہ کام ختم ہو جاتا ہے' اسی طرح ایمان اور تعلیم قرآن کی انتہا محبت الٰہی ہے' تمام نبیوں کی تعلیم کا مرکز اور مغز یہی تھا اور روحانی زندگی اسی کا نام ہے۔ قرآن تو اس تعلیم سے لبریز ہے' مگر توریت اور انجیل میں بھی یہ حکم صاف صاف سنا دیا گیا ہے۔ عیسیٰ علیہ السلام سے پوچھا گیا کہ توریت کے احکام میں سب سے اعلیٰ حکم کیا ہے تو فرمایا: ''خدا کی محبت تمام دل' تمام روح' تمام عقل سے کرنا' یہی سب سے اوّل اور اعظم حکم ہے۔'' (متی ۲۲)

جس طرح محبتِ الٰہی دین کی غایت ہے اسی طرح محبت کی جان اخلاص ہے۔ منہ سے محبت کا دم بھرنا اور چیز ہے اور اخلاصِ محبت اور ؎

خلقے زباں بدعویٔ عشقش کشادہ اند
اے من غلامِ آنکہ دلش با زباں یکے است (۱)

محبت کا لغوی مفہوم

محبت لغوی اعتبار سے دوستی' الفت' حب' ولا' مہر' مَوَدّت' آشتی' وفاق اور چاہت کا نام ہے۔(۲) صاحبِ ''مفردات القرآن'' محبت کا مفہوم یوں بیان کرتے ہیں:

''اَلْمَحَبَّۃ کے معنی کسی چیز کو اچھا سمجھ کر اس کا ارادہ کرنے اور چاہنے کے ہیں اور محبت تین قسم پر ہے: (ا) محض لذّت اندوزی کے لیے' جیسے مرد کسی عورت سے محبت کرتا ہے۔ ﴿وَيُطْعِمُوْنَ الطَّعَامَ عَلٰى حُبِّهٖ مِسْكِيْنًا﴾ (الدھر:۸) (ب) محبت نفع اندوزی کی خاطر' جیسا کہ انسان کسی نفع بخش اور مفید شے سے محبت کرتا ہے۔ چنانچہ اسی معنی میں فرمایا: ﴿وَاُخْرٰى تُحِبُّوْنَهَا ؕ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِيْبٌ ؕ﴾ (الصف:۱۳) ''اور ایک چیز جس کو تم بہت چاہتے ہو' یعنی تمہیں خدا کی طرف سے مدد نصیب ہوگی اور فتح حاصل ہوگی۔'' (ج) کبھی یہ محبت محض فضل و شرف کی وجہ سے ہوتی ہے' جیسا کہ اہلِ علم و فضل آپس میں ایک دوسرے سے محض علم کی خاطر محبت کرتے ہیں: ﴿فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ﴾ (التوبۃ:۱۰۸) (۳)

عشق اور محبت میں فرق

عشق کا لفظ بھی محبت کے مفہوم میں استعمال کیا جاتا ہے' مگر دونوں کی معنویت میں خاصا فرق ہے۔ محبت میں چاہت اور اُلفت ایک تناسب سے ہے' مگر عشق کے ڈانڈے جنون سے جا ملتے ہیں۔ قاضی محمد سلیمان منصور پوریؒ قاموس کے حوالے سے رقم طراز ہیں:

''**الجنون فنون والعشق من فنه يستجله المرء على نفسه باستحسان بعض الصور والشمائل** یعنی جُنون کے بہت سے اقسام ہیں' عشق بھی جنون کی ایک قسم ہے۔ اس مرض کو انسان اپنے نفس پر بعض صورتوں یا خصلتوں کے اچھا سمجھ لینے سے خود وارد کر لیا کرتا ہے۔ پس جب عشق کے معنی قسمے از جنون ہوئے تو ضروری تھا کہ خدا و رسول ﷺ کے پاک کلام میں اس لفظ کا استعمال نہ کیا جاتا اور اسے فضائل محمودہ یا محاسن جمیلہ سے شمار نہ کیا جاتا۔ بے شک قرآن حکیم اور احادیثِ رسول کریم ﷺ میں لفظ محبت کا استعمال ہوا ہے' اور اس سے ثابت ہو گیا کہ محبت ہی صفتِ کمالِ انسانی ہے۔ محبت اور عشق میں یہ بھی فرق ہے کہ محبت روح کے میلانِ صحیحہ کا نام ہے اور عشق میں اس شرط کا پایا جانا ضروری نہیں۔'' (۴)

حُبّ اور مَحبّۃ کے ہم معنی الفاظ

(حَبَّ' یَحِبُّ' حُبًّا) قرآن حکیم میں حُبّ کے مشتقات تقریباً ۸۳ (تراسی) مقامات پر استعمال ہوئے ہیں۔ حبّ اور محبّۃ کے ہم معنی الفاظ ودّ اور مودّۃ بھی ہیں' سورۃ الشوریٰ میں ہے: ﴿قُلْ لَّآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا اِلَّا الْمَوَدَّةَ فِى الْقُرْبٰى ؕ﴾ (آیت ۲۳) ''(اے نبی ﷺ! ان لوگوں سے) کہہ دو کہ میں اس کام پر تم سے کسی اجر کا طالب نہیں ہوں' البتہ قرابت کی محبت ضرور چاہتا ہوں''۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت میں محبت اور رحمت کا جذبہ پیدا کر رکھا ہے۔ سورۃ الروم میں فرمایا گیا: ﴿وَجَعَلَ بَيْنَكُمْ مَّوَدَّةً وَّرَحْمَةً ؕ﴾ (الروم:۲۱) ''اور

تمہارے درمیان محبت اور رحمت پیدا کر دی‘‘۔ کسی سے محبت کرنے اور اسے چاہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس کی پسند کو اپنی پسند اور ناپسندیدگی کو اپنی ناپسندیدگی بنا لے‘ اپنے محبوب کی راہ پر گامزن ہو جائے اور اس کی خوشنودی کی خاطر ہر چیز قربان کرنے پر آمادہ اور تیار رہے‘ وہ اس کے نقوشِ قدم اور نشاناتِ راہ کو اپنے لیے سرمایۂ افتخار سمجھے۔ بندہ جب اپنے ربّ سے محبت کرنے کا دعویٰ کرے تو پھر اس کی اطاعت میں سرگرمِ عمل رہے اور اس کی نگاہِ لطف و کرم کا ہر لحظہ طلب گار اور آرزومند رہے‘ اس کے ساتھ کسی کو شریک کرنے سے مجتنب رہے۔ ایسے میں اللہ بھی اپنے بندے سے محبت کرتا ہے‘ اس کی کارسازی کرتا ہے اور اس کی حمایت و نصرت فرماتا ہے اور اسے اپنی بیش بہا نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے۔ گویا محبت کا تقاضا اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت ہے۔ صاحبِ مشکوٰۃ نے شعب الایمان للبیہقی کے حوالے سے حضرت عبدالرحمٰن بن ابی قراد رضی اللہ عنہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ:

اَنَّ النَّبِیَّ ﷺ تَوَضَّاَ یَوْمًا‘ فَجَعَلَ اَصْحَابُہٗ یَتَمَسَّحُوْنَ بِوَضُوْئِہٖ‘ فَقَالَ لَھُمُ النَّبِیُّ ﷺ: ((مَا یَحْمِلُکُمْ عَلٰی ھٰذَا؟)) قَالُوْا: حُبُّ اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ‘ فَقَالَ النَّبِیُّ ﷺ: ((مَنْ سَرَّہٗ اَنْ یُّحِبَّ اللّٰہَ وَرَسُوْلَہٗ اَوْ یُحِبُّہُ اللّٰہُ وَرَسُوْلُہٗ فَلْیَصْدُقْ حَدِیْثَہٗ اِذَا حَدَّثَ وَلْیُؤَدِّ اَمَانَتَہٗ اِذَا اؤْتُمِنَ وَلْیُحْسِنْ جِوَارَ مَنْ جَاوَرَہٗ)) (۵)

’’ایک دن حضور نبی کریم ﷺ نے وضو کیا تو آپؐ کے کچھ اصحاب آپؐ کے وضو کا پانی لے کر اپنے چہروں پر ملنے لگے۔ نبی اکرم ﷺ نے ان سے پوچھا: ’’تمہارے اس کام کا محرک کیا ہے؟‘‘ لوگوں نے کہا: اللہ اور اُس کے رسول سے محبت۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ’’جس کسی کو یہ پسند ہو کہ وہ اللہ و رسول سے محبت کرے یا اللہ اور اس کا رسول اس سے محبت کرے تو اسے چاہیے کہ جب بات کرے تو سچ بولے‘ اور جب اس کے پاس کوئی امانت رکھی جائے تو اس کو (بحفاظت) مالک کے حوالے کرے اور پڑوسیوں کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔‘‘

گویا محبت کا اونچا مقام یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام پر عمل پیرا ہوا جائے اور اپنے روابط‘ عہد و پیمان اور معاملات کو درست رکھا جائے۔

محبت کے مختلف انداز

حسنِ کردار اور حسنِ سیرت محبت کے جذبوں کو فروزاں کرتی ہے۔ دلکشا‘ شیریں اور

سرمدی آواز بھی دل کو لبھاتی ہے۔ گفتار میں ملائمت اور مزاج کی حلاوت بھی دوسرے کو اپنا گرویدہ بناتی ہے۔ محسنِ انسانیت ﷺ نہ تو سنگ دل تھے اور نہ تُرش رو‘ چنانچہ کارواں بنتا گیا اور آگے بڑھتے گئے اور اپنی زندگی ہی میں وہ انقلاب لانے میں فائز المرام ہو گئے جس کے لیے باری تعالیٰ نے انہیں مبعوث فرمایا تھا۔ محبت کے اسالیب متنوّع ہوتے ہیں‘ گاہے چاہتوں کا جذبہ محبوب کی طرف کشاں کشاں لے جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے کوہِ طور پر طلب فرمایا تو وہ قوم کو ساتھ لے کر منزل کی جانب روانہ ہوئے‘ مگر اپنے رب کی ملاقات کے شوق میں آگے چلے گئے تھے۔ طور کی جانب ایمن میں جہاں کا وعدہ بنی اسرائیل سے کیا گیا تھا‘ ابھی قافلہ پہنچنے بھی نہ پایا تھا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اکیلے روانہ ہو گئے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے جواب طلبی بھی ہوئی تھی: ﴿وَمَآ اَعْجَلَكَ عَنْ قَوْمِكَ يٰمُوْسٰى ۝۸۳﴾ (طٰہٰ) ’’اے موسیٰ! تم اپنی قوم کو چھوڑ کر قبل از وقت کیوں آ گئے ہو؟‘‘ اس پر آپؑ نے جواب دیا کہ پروردگار! میں تو تیری محبت اور تجھ سے گفتگو کرنے کے شوق میں اس لیے جلدی آیا تھا کہ تو اس سے خوش ہو گا: ﴿وَعَجِلْتُ اِلَيْكَ رَبِّ لِتَرْضٰى ۝۸۴﴾ — اس کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کا دیدارِ الٰہی کی استدعا کرنا‘ جس کے جواب میں اللہ کا یہ فرمانا کہ تو مجھے نہیں دیکھ سکتا‘ یہ کچھ وفورِ شوق میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کیا۔ گویا محبت دل لبھانے والی گفتار سے بھی جاگ اٹھتی ہے۔ حضرت جامی نے فرمایا تھا ؎

نہ تنہا عشق از دیدار خیزد　　بسا کین دولت از گفتار خیزد

یعنی دیدار ہی سے محبت کا احساس نہیں اُبھرتا بلکہ گفتگو سے بھی اندر کا یہ میلان نمو پا لیتا ہے۔ ﴿رَبِّ اَرِنِيْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ﴾ اسی حسن دلربا کا کرشمہ ہے۔ اسی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو یہ شرف ملا کہ فرمایا گیا:

﴿ وَاَلْقَيْتُ عَلَيْكَ مَحَبَّةً مِّنِّيْ ۚ وَلِتُصْنَعَ عَلٰى عَيْنِيْ ۝۳۹﴾ (طٰہٰ)

’’اور ہم نے تجھ پر اپنی طرف سے محبت ڈال دی‘ اور ایسا انتظام کیا کہ تو میری نگرانی میں پالا جائے۔‘‘

چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے محل میں پرورش پاتے رہے اور ہر طرح سے محفوظ و مصئون رہے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کی رسول اللہ ﷺ سے محبت

عظیم صحابیٔ رسول حضرت بلال رضی اللہ عنہ بن رباح نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد بہت

زیادہ ملولِ خاطر تھے اور غم سے نڈھال تھے۔ اس رفیق رسول کی آپ ﷺ سے محبت کا یہ عالَم تھا کہ انہوں نے اذان دینے سے معذرت کر لی تھی۔ ڈاکٹر محمد عبدالرؤف لکھتے ہیں:

''وہ حسبِ معمول فجر کے وقت سے کچھ دیر پہلے مسجد پہنچے' نمازی حسب دستور نماز کے لیے جمع ہونے شروع ہو گئے' لیکن آج روزانہ کے معمولات میں کچھ فرق آ گیا تھا' آج رسول اللہ ﷺ کے حجرۂ مبارک کا دروازہ بند تھا' یہ دیکھ کر حضرت بلالؓ کے آنسو ایک مرتبہ پھر رواں ہو گئے۔ وہ اب کبھی بھی اس دروازے کے پاس جا کر آواز نہ لگا پائیں گے: ''یارسول اللہ! نماز کا وقت ہو گیا ہے''۔ انہی سوچوں میں گم وہ مسجد کی چھت پر اذان دینے کے لیے پہنچے اور بآوازِ بلند اذان دینی شروع کی: اللّٰہ اکبر' اللّٰہ اکبر..... جب اَشْھَدُ اَنَّ مُحَمَّدًا رَّسُوْلُ اللّٰہِ پر پہنچے تو وہ نامِ مُحَمَّد ادا نہ کر پائے اور بے اختیار ہچکیاں لے کر رونے لگے' مسجد میں جمع نمازی حضرت بلالؓ کی آہ و بکا سن کر خود بھی زار و قطار رونے لگے۔ حضرت بلالؓ نے کسی نہ کسی طرح باقی ماندہ اذان مکمل کر لی مگر مستقبل میں اذان دینے سے معذرت کر لی۔''(۶)

ایمانِ کامل کا اقتضا

اللہ تعالیٰ کی محبت ایمانِ کامل کا اقتضا ہے۔ اہلِ ایمان کا وصف یہ ہے کہ وہ اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں۔ فرمایا: ﴿وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ؕ﴾ (البقرۃ:۱۶۵) ''اور (وحدتِ خداوندی پر دلالت کرنے والے ان کھلے آثار کے ہوتے ہوئے بھی) کچھ لوگ ایسے ہیں کہ جو اللہ کے سوا دوسروں کو ہمسر اور مدّ مقابل بناتے ہیں اور ان کے ایسے گرویدہ ہیں جیسی اللہ کے ساتھ گرویدگی ہونی چاہیے' حالانکہ ایمان والے سب سے بڑھ کر اللہ کو محبوب رکھتے ہیں''— حاجت روائی' مشکل کشائی' فریاد رسی' دعائیں سننا وغیرہ اللہ کی صفات ہیں اور اللہ ہی کا یہ حق ہے کہ اسے مقتدرِ اعلیٰ مانا جائے' اعتراف بندگی میں اس کے سامنے سر جھکایا جائے' اسی سے امیدیں وابستہ کی جائیں' اسی کی رضا کو ہر دوسری رضا پر مقدم سمجھا جائے' مگر بعض لوگوں کا وطیرہ یہ ہے کہ وہ ان صفات کو بناوٹی معبودوں سے منسوب کر دیتے ہیں اور یوں ان کو اللہ کا مدّ مقابل اور ہمسر بناتے ہیں۔ اَلْحُبُّ لِلّٰهِ وَالْبُغْضُ لِلّٰهِ کے مصداق محبت کا اصلی اور حقیقی حق دار اللہ ہے' کسی مخلوق سے ایسی محبت شرک کے زمرے میں آتی ہے۔ انبیاء و اولیاء کی محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہونی چاہئیں۔ کسی کی محبت میں غلو مشرکانہ اعمال کی جڑ ہے جس سے ایک مؤمن کو پناہ

طلب کرنی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ قرآن حکیم میں ارشاد فرماتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَنْ يَّرْتَدَّ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَسَوْفَ يَاْتِى اللّٰهُ بِقَوْمٍ يُّحِبُّهُمْ وَيُحِبُّوْنَهٗٓ ۙ اَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اَعِزَّةٍ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ۡ يُجَاهِدُوْنَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَلَا يَخَافُوْنَ لَوْمَةَ لَآئِمٍ ؕ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ﴾ (المائدۃ)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اگر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھرتا ہے (تو پھر جائے) عنقریب اللہ کوئی دوسری قوم لے آئے گا جو اللہ کو محبوب ہو گی اور اللہ ان کو محبوب ہو گا' جو مؤمنوں پر نرم اور کفار پر سخت ہوں گے' جو اللہ کی راہ میں جدوجہد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ یہ اللہ کا فضل ہے جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے' اور اللہ وسیع ذرائع کا مالک ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔''

اس آیۂ کریمہ میں اللہ سے محبت کرنے والوں کی اہم صفات کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ وہ مؤمنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ہوتے ہیں' اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں' کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے خائف نہیں ہوتے' اہلِ ایمان کے مقابلے میں اپنی طاقت کا استعمال نہیں کرتے' اللہ کے دین کے غلبہ و استیلاء کے لیے کوشاں رہتے ہیں اور حالات کی نامساعدت سے شکستہ خاطر نہیں ہوتے۔

محبت کا اعلیٰ درجہ

قرآن حکیم میں اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان سے مخاطب ہو کر فرماتا ہے:

﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوْٓا اٰبَآءَكُمْ وَاِخْوَانَكُمْ اَوْلِيَآءَ اِنِ اسْتَحَبُّوا الْكُفْرَ عَلَى الْاِيْمَانِ ؕ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِىْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِىَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ۝﴾ (التوبۃ)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو' اپنے باپوں اور بھائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ اگر وہ ایمان پر کفر کو ترجیح دیں۔ اور تم میں سے جو ان کو رفیق بنائیں گے وہی ظالم ہوں گے۔ (اے

نبی ﷺ!) کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ' اور تمہارے بیٹے' اور تمہارے بھائی' اور تمہاری بیویاں' اور تمہارے عزیز و اقارب' اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں' اور تمہارے وہ کاروبار جن کے ماند پڑ جانے کا تم کو خوف ہے' اور تمہارے وہ گھر جو تم کو پسند ہیں' اگر (یہ سب) تم کو اللہ اور اس کے رسول اور اس کی راہ میں جہاد کرنے سے عزیز تر ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ (تمہارے سامنے) لے آئے۔ اور اللہ فاسق لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے فرمایا:

((لَا يُؤْمِنُ اَحَدُكُمْ حَتّٰى اَكُوْنَ اَحَبَّ اِلَيْهِ مِنْ وَالِدِهٖ وَوَلَدِهٖ وَالنَّاسِ اَجْمَعِيْنَ))(۷)

''تم میں سے کوئی آدمی اس وقت تک مؤمن نہیں ہوسکتا جب تک میں اس کے نزدیک اس کے باپ اور اولاد اور دنیا کے تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

حضرت ابوامامہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اَحَبَّ لِلّٰهِ وَاَبْغَضَ لِلّٰهِ وَاَعْطٰى لِلّٰهِ وَمَنَعَ لِلّٰهِ فَقَدِ اسْتَكْمَلَ الْاِيْمَانَ))(۸)

''جس نے کسی سے محبت کی تو اللہ کے لیے اور نفرت رکھی تو وہ بھی اللہ ہی کے لیے اور مال کو خرچ کیا تو وہ بھی اللہ کے لیے اور کسی جگہ خرچ کرنے سے رکا تو وہ بھی اللہ کے لیے' تو اُس نے اپنا ایمان مکمل کرلیا۔''

صاحبِ معارف القرآن قاضی بیضاوی کا یہ ارشاد نقل کرتے ہیں کہ:

''محبت سے مراد اس جگہ اختیاری محبت ہے' غیر اختیاری اور طبعی محبت مراد نہیں' کیونکہ اللہ تعالیٰ کسی انسان کو اس کی طاقت و اختیار سے زیادہ تکلیف نہیں دیتے۔''

محبت کا اعلیٰ مقام یہی ہے کہ محبت طبیعت پر بھی غالب آ جائے اور محبوب کے حکم کی تعمیل کی لذّت پر تلخی و تکلیف کو بھی لذیذ بنا دے۔ صحیحین کی ایک حدیث میں ہے کہ رسول اکرم ﷺ نے فرمایا کہ تین خصلتیں ایسی ہیں کہ وہ جس شخص میں پائی جائیں تو اس کو ایمان کی حلاوت حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ تین خصلتیں یہ ہیں: (i) اللہ اور اس کا رسول ﷺ اس کے نزدیک ان کے ماسوائے ہر چیز سے زیادہ محبوب ہو (ii) اللہ کے بندے سے صرف اللہ ہی کے لیے محبت رکھے (iii) کفر و شرک اس کو آگ میں ڈالے جانے کے برابر محسوس ہو''۔ حلاوت سے مراد محبت کا یہی مقام ہے جو انسان کے لیے ہر مشقت اور محنت کو لذیذ بنا دیتا ہے۔ ع ''از محبت تلخہا شیریں شود''۔ اس مقام سے متعلق بعض علماء نے کہا ہے ؎

واذا حلّت الحلاوة قلبًا نشطت فی العبادة الاعضاء

''جب کسی دل میں حلاوتِ ایمان پیدا ہو جاتی ہے تو عبادت و اطاعت میں اس کے اعضاء لذّت پانے لگتے ہیں۔''

حلاوت کو بعض روایات میں بشاشتِ ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قاضی بیضاوی نے فرمایا ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی سنّت اور شریعت کی حفاظت اور اس میں رخنے ڈالنے والوں کی مدافعت بھی اللہ و رسول کی محبت کا ایک کھلا نشان ہے۔(۹)

اللہ کے پسندیدہ بندے

اللہ تعالیٰ جن بندوں کو پسند کرتا ہے اور جنہیں محبوبیت کا درجہ حاصل ہے وہ ان کی خصوصیات اپنی کتاب کریم میں جابجا گنواتا ہے۔ ان کی صفت کے ساتھ یحبّ کے الفاظ استعمال کرتا ہے: ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝۱۹۵﴾ (البقرۃ) ''بے شک اللہ احسان کرنے والوں سے محبت کرتا ہے''۔ اسی طرح وہ توبہ کرنے والوں' پاکیزگی اختیار کرنے والوں' توکل کرنے والوں' عدل و انصاف سے کام لینے والوں' تقویٰ اختیار کرنے والوں' صبر کرنے والوں کو دوست رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان افراد کو بھی محبوب گردانتا ہے جو اُس کی راہ میں بنیانِ مرصوص ہو کر جنگ کرتے ہیں۔ ان کی یہ لڑائی اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور دین کو عملاً قائم اور نافذ کرنے کے لیے ہوتی ہے۔ گویا احسان' توبہ' توکّل' صبر' قتال فی سبیل اللہ ایسی صفات ہیں جو بندۂ مؤمن کو کامل مؤمن بناتی ہیں اور پھر اسے اللہ کی رفاقت اور دوستی کا شرف حاصل ہو جاتا ہے۔

اللہ کے ناپسندیدہ بندے

اللہ تعالیٰ کے ہاں جو لوگ مبغوض قرار پاتے ہیں اور وہ انہیں ناپسند کرتا ہے' وہ ان کی صفاتِ سیئہ کی بھی کتاب اللہ میں صاف صاف نشان دہی کرتا ہے۔ ان کی اس رذالت کے ساتھ لَا يُحِبُّ کے الفاظ استعمال کرتا ہے۔ وہ کفر و شرک کو ہرگز پسند نہیں کرتا: ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِيْنَ ۝۳۲﴾ (آل عمران) ''بے شک اللہ انکار کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا''۔ اسی طرح اللہ ایسے لوگوں کو بھی ناپسند کرتا ہے جو اس کی اور اس کے رسولؐ کی اطاعت سے انکار کرتے ہوں۔ اسی طرز پر وہ زیادتی کرنے والوں یعنی سرکشوں کو ناپسندیدگی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ وہ ایسے شخص سے بھی محبت نہیں رکھتا جو اپنے پندار میں مغرور ہو اور اپنی بڑائی پر فخر کرے۔ معصیت پیشہ اور خائن لوگ بھی اسے ناپسند ہیں۔ گھمنڈ میں پھولنے والوں' اترانے والوں'

مفسدوں' بدگوئی پر زبان کھولنے والوں' اسراف کرنے والوں' غرورِ نفس میں مبتلا لوگوں اور ظلم و زیادتی کرنے والوں کو وہ دوست نہیں رکھتا اور ان سے نفرت کرتا ہے۔ یہ وہ رذائل اخلاق ہیں جن پر ہر مؤمن کو نفرین بھیجنی چاہیے اور ان صفاتِ سیئہ کے موردکے قریب بھی نہ پھٹکنا چاہیے۔

محبّت کی کسوٹی

اللہ کی محبت کے مدّعی تو بہت ہیں۔ حضور ﷺ کے زمانے میں منافقین بھی محبت کا دعویٰ کرتے تھے' یہود و نصاریٰ بھی اپنے آپ کو اللہ کا چہیتا سمجھتے تھے' مگر اللہ کے ہاں اس کی محبت کھری اور سچی ہے جو اللہ اور اس کے رسول کا مطیع و فرمانبردار ہو' ان کے احکامات و فرامین کے سامنے اپنا سر جھکا لیتا ہو اور ان سے آگے بڑھنے سے باز رہتا ہو' نبی کی آواز اور ان کے قول کے سامنے اپنی آواز دھیمی رکھتا ہو۔ قرآن مجید کی یہ آیات ہر ساعت اور ہر لمحہ اس کے پیش نظر ہوں:

قُلۡ اِنۡ کُنۡتُمۡ تُحِبُّوۡنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوۡنِیۡ یُحۡبِبۡکُمُ اللّٰہُ وَ یَغۡفِرۡ لَکُمۡ ذُنُوۡبَکُمۡ ؕ وَ اللّٰہُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۳۱﴾ قُلۡ اَطِیۡعُوا اللّٰہَ وَ الرَّسُوۡلَ ۚ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا فَاِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الۡکٰفِرِیۡنَ ﴿۳۲﴾ (آل عمران)

''(اے نبی ﷺ!) ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم حقیقت میں اللہ سے محبت رکھتے ہو تو میری پیروی اختیار کرو' اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطاؤں سے درگزر فرمائے گا۔ وہ بڑا معاف کرنے والا اور رحیم ہے۔ ان سے کہو کہ اللہ اور رسول کی اطاعت قبول کر لو' پھر اگر وہ تمہاری دعوت قبول نہ کریں تو یقیناً اللہ انکار کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (یعنی یہ ممکن نہیں ہے کہ اللہ ایسے لوگوں سے محبت کرے جو اس کی اور اس کے رسول کی اطاعت کے منکر ہوں)۔''

معلوم ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی اطاعت اور اللہ کی فرمانبرداری محبت کی اصل کسوٹی اور معیار ہے' اسی پر یہ جانچا جا سکے گا کہ اللہ سے محبت اور دوستی کا دعویٰ کرنے میں کون سچا ہے۔ حضرت حسن بصریؒ نے ان آیات کی تفسیر کرتے ہوئے فرمایا:

زعم اقوام علٰی عهدِ رسول اللّٰه ﷺ انهم يحبون اللّٰه فاراد ان يجعل لقولهم تصديقا من عمل ' فمن ادعى محبته وخالف سنة رسوله فهو كذّاب و كتاب اللّٰه يكذّبه(۱۰)

''رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں چند گروہوں نے گمان کیا کہ وہ بھی اللہ سے محبت رکھتے ہیں۔ اللہ نے ان کے قول کی عملی تصدیق کے لیے ان کے سامنے یہ کسوٹی رکھ

دی۔ پس جو شخص اللہ کی محبت کا دعویٰ کرتا اور اس کے رسول کی سنّت کی مخالفت کرتا ہے وہ بڑا جھوٹا ہے اور اللہ کی کتاب اس کے دعوے کی تکذیب کرتی ہے۔''

اطاعتِ رسول ﷺ کی روشنی میں یہ پرکھا جا سکے گا کہ وہ اللہ کا محبّ ہے یا نہیں۔ جو چیز مؤمن کو مقامِ محبوبیت پر فائز کرتی ہے وہ اتباع و اطاعت ہے نہ کہ خالی خولی زبانی دعویٰ۔ قرآن مجید واضح کرتا ہے کہ ایمان اور عمل صالح کی بدولت بندہ اللہ کا محبوب بن سکتا ہے:

﴿اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَہُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا ﴿۹۶﴾﴾ (مریم)

''یقیناً جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کر رہے ہیں عنقریب رحمٰن ان کے لیے دلوں میں محبت پیدا کر دے گا۔''

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا اَحَبَّ اللّٰهُ الْعَبْدَ نَادٰى جِبْرِيْلَ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَاَحْبِبْهُ، فَيُحِبُّهُ جِبْرِيْلُ' فَيُنَادِي جِبْرِيْلُ فِيْ اَهْلِ السَّمَاءِ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ فُلَانًا فَاَحِبُّوْهُ، فَيُحِبُّهُ اَهْلُ السَّمَاءِ' ثُمَّ يُوْضَعُ لَهُ الْقَبُوْلُ فِي الْاَرْضِ))(۱۱)

''جب اللہ بندے سے محبت کرتا ہے تو جبریل کو پکار کر کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تو بھی اس سے محبت رکھ۔ چنانچہ جبرئیل اس سے محبت کرتے ہیں اور آسمان والوں میں منادی کرتے ہیں کہ اللہ فلاں بندے سے محبت کرتا ہے تم لوگ بھی اس سے محبت رکھو' تو اہلِ آسمان اس سے محبت رکھتے ہیں' پھر اس شخص کے لیے زمین میں حسن قبول پیدا کر دیا جاتا ہے۔''

صوفیائے کرامؒ کے اقوال

صوفیائے کرام میں سے حضرت سہل تستریؒ نے کہا ہے: ''اللہ تعالیٰ کی علی الدّوام اور مسلسل اطاعت اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے ہمیشہ پرہیز و اجتناب کا نام محبت ہے''۔ حضرت یحییٰ بن معاذؒ نے کہا: ''جس نے اللہ کی محبت کا دعویٰ کیا اور اس کے مقرّر کیے ہوئے حدود کی حفاظت نہ کی (یعنی اللہ تعالیٰ کے اوامر و نواہی کی) وہ اپنے دعویٰ میں سچا نہیں ہے''۔ سید مصطفیٰ عروسی فرماتے ہیں:

تعصی الالٰه وانت تظهر حبه هذا لعمری فی القیاس بدیع
لو کان حبك صادقا لاطعته ان المحب لمن یحب مطیع(۱۲)

''تم معبود کی نافرمانی کرتے اور اس کی محبت کا اظہار کرتے ہو۔ قسم بجاں یہ بات عقلاً نرالی ہے۔ اگر تمہاری محبت سچی ہوتی تو یقیناً اس کی اطاعت کرتے' کیونکہ محبّ اپنے محبوب کا مطیع ہوتا ہے۔''

قرآن وحدیث اور صوفیاء کرامؒ کے اقوال کی روشنی میں محبت اتباعِ رسول ﷺ اور اللہ کی اطاعت کا نام ہے۔ اسی کسوٹی پر پرکھنے سے یہ مترشح ہو سکے گا کہ کون اللہ کا حبیب' دوست اور خلیل ہے۔

حواشی

(۱) مجموعہ تفاسیر فراہی' صفحہ ۵۲۱' ۵۲۲۔

(۲) فرہنگ عامرہ از محمد عبداللہ خان خویشگی۔

(۳) مفردات القرآن از علامہ راغب اصفہانی۔

(۴) رحمۃ للعالمین' ص ۳۲۴۔

(۵) مشکوٰۃ المصابیح' کتاب الآداب' باب الشفقة والرحمة على الخلق۔

(۶) بلال بن رباح از ڈاکٹر محمد عبدالرؤف' ص ۸۴' ۸۵۔

(۷) صحیح البخاری' کتاب الایمان' باب حب الرسول من الایمان۔ وصحیح مسلم' کتاب الایمان' باب وجوب محبة رسول اللّٰہ ﷺ اکثر من الاهل والولد والوالد۔

(۸) سنن ابی داؤد' کتاب السنة' باب الدلیل علی زیادة الایمان ونقصانه۔

(۹) معارف القرآن' جلد چہارم' سورۃ التوبۃ۔

(۱۰) حاشیہ تفسیر جلالین' بحوالہ اسلامی تصوف از سید احمد عروج قادری۔

(۱۱) صحیح البخاری' کتاب بدء الخلق' باب ذکر الملائکة' وصحیح مسلم' کتاب البر والصلة والآداب' باب اذا احب اللّٰہ عبدا حببه الی عباده۔

(۱۲) اسلامی تصوف از سید احمد عروج قادری' ص ۲۹۱۔

❁❁❁

قرآن حکیم کی مقدس آیات اور احادیث نبویؐ آپ کی دینی معلومات میں اضافے اور دعوت وتبلیغ کے لیے شائع کی جاتی ہیں۔ ان کا احترام آپ پر فرض ہے۔ لہٰذا جن صفحات پر یہ آیات درج ہیں ان کو صحیح اسلامی طریقے کے مطابق بے حرمتی سے محفوظ رکھیں۔

شَمَائِلُ الرَّسُوْل ﷺ

نبی آخر الزّماں ﷺ کا حلیہ مبارک

مرتّب: حافظ محمد زاہد ☆

نبی آخر الزماں حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے اُسوۂ مبارکہ اور سیرتِ طیبہ کے متعدد گوشے ہیں‘ جن میں سے ہمارے نزدیک اہم ترین دین اسلام کی دعوت و تبلیغ اور اس کی سربلندی کے لیے جدّوجہد ہے۔ یہ آنحضور ﷺ کی وہ سنت ہے جس سے آپؐ کی حیاتِ طیبہ کا ایک لمحہ بھی خالی نہیں رہا۔ تاہم آنحضور ﷺ کے اُسوۂ وسیرت کے تمام گوشے ہی انوار و برکات کے حامل ہیں اور آپ ﷺ کی ذاتِ گرامی کا ذکر کسی پہلو سے بھی کیا جائے‘ موجبِ خیر و سعادت ہے۔

ربیع الاول اسلامی سال کا تیسرا اور بہت ہی برکتوں‘ سعادتوں اور رحمتوں کے نزول کا مہینہ ہے۔ اس مہینہ میں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کی ولادت باسعادت ہوئی‘ اسی ماہ میں آپؐ کو چالیس سال کی عمر میں نبوت ملی اور پھر اسی ماہ میں ۶۳ سال کی عمر میں آپؐ کا وصال ہوا۔ رسول اکرم ﷺ کا ذکر:

﴿وَرَفَعْنَا لَكَ ذِكْرَكَ ۝۴﴾ (الانشراح) ’’اور ہم نے آپؐ کا ذکر بلند کر دیا۔‘‘

کے مصداق ویسے تو دنیا کے کونے کونے میں ہر وقت جاری و ساری ہے‘ لیکن ماہِ ربیع الاول کے آتے ہی آپ ﷺ کا ذکر پوری دنیا میں اور بالخصوص برصغیر پاک و ہند میں اپنے عروج کو پہنچ جاتا ہے۔ ہر طرف درود و سلام کی محفلیں منعقد ہوتی ہیں اور جا بجا آپ ﷺ کی نعت گویائی ہوتی ہے۔

نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے سب سے بڑے نعت گو تو صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم

☆ ادارتی معاون‘ شعبہ مطبوعات‘ قرآن اکیڈمی‘ لاہور

اجمعین کا طبقہ ہے جنہوں نے اپنے محبوب ﷺ کے کمالاتِ معنوی کے ساتھ ساتھ آپؐ کے کمالاتِ ظاہری‘ آپؐ کے حسن و جمال‘ آپؐ کی ایک ایک ادا‘ حتیٰ کہ آپؐ کے جسم مبارک کو بغور دیکھا‘ یاد رکھا اور پھر اسے آگے بیان کر کے ہم پر احسانِ عظیم کیا کہ آج ہم اُن کی بیان کردہ احادیث کی روشنی میں نبی آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کے حلیہ مبارک اور حسن و جمال کا تصور اپنی آنکھوں میں لا سکتے ہیں۔ انہوں نے نبی اکرم ﷺ کے حلیہ مبارک اور حسن و جمال کی خوب سے خوب تر تصویر کشی کی ہے اور اُمتِ مسلمہ کو یہ بتایا کہ بنی نوعِ انسان کے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے جسمانی خدوخال‘ قد و قامت اور اعضاء کی کیفیت کیسی تھی۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے بعد اس حوالے سے سب سے زیادہ خدمات محدّثین کرام رحمہم اللہ اور آپؐ کے حلیہ مبارک اور طرزِ زندگی کو بیان کرنے کے حوالے سے بالخصوص امام ترمذی رحمہ اللہ کی ہیں جنہوں نے نبی اکرم ﷺ سے اپنے عشق و محبت کے اظہار کا ایک نرالا طرز اختیار کیا اور ’’شمائل ترمذی‘‘ کے عنوان سے ان تمام احادیث کو یکجا کر دیا جو نبی آخر الزمان حضرت محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے حلیہ مبارک اور طرزِ زندگی سے متعلق تھیں۔

نبی اکرم ﷺ کے حسن و جمال کو مکمل ظاہر نہیں کیا گیا!

نبی آخر الزماں ﷺ کے حسن و جمال کے بارے میں ایک رائے یہ ہے کہ آپؐ کے حسن و جمال کو مکمل طور پر ظاہر نہیں کیا گیا‘ اس لیے کہ اگر آپؐ کے حسن و جمال کو مکمل طور پر ظاہر کر دیا جاتا تو کوئی آنکھ بھی آپؐ کو دیکھنے کی طاقت نہ رکھتی۔ بقول امام قرطبیؒ:

لم یظهر لنا تمام حسنه لانه لو ظهر لنا تمام حسنه لما اطاقت اعیننا رؤیته

’’رسول اللہ ﷺ کا پورا جمال ظاہر نہیں کیا گیا‘ اگر آپؐ کا تمام حسن و جمال ظاہر کر دیا جاتا تو ہماری آنکھیں آپؐ کو دیکھنے کی طاقت نہ رکھتیں۔‘‘

باوجود اس کے کہ نبی اکرم ﷺ کا مکمل حسن ظاہر نہیں کیا گیا‘ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم رسول اللہ ﷺ کو آنکھ بھر کر دیکھ نہیں سکتے تھے۔ حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

لما نظرت الی انواره وضعت کفی علی عینی خوفا من ذهاب بصری

’’میں نے جب بھی آپؐ کے انوار کی طرف دیکھا تو اپنی بینائی جانے کے ڈر سے آنکھوں پر اپنی ہتھیلیاں رکھ لیں۔‘‘

دوسری بات اس حوالے سے یہ مستحضر رہنی چاہیے کہ نبی اکرم ﷺ کے اوصافِ حمیدہ اور

آپؐ کے جمال وکمال کی اصل حقیقت اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں اور جس نے بھی آپؐ کے حسن و جمال کو بیان کیا اس نے تمثیل کا سہارا لے کر آپؐ کے جمال وکمال کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ علامہ ابراہیم بیجوریؒ فرماتے ہیں:

ومن وصفه فانما وصفه على سبيل التمثيل والا فلا يعلم احد حقيقة وصفه الا خالقه

''جس کسی نے آپ ﷺ کے اوصاف بیان کیے بطور تمثیل بیان کیے ورنہ ان کے اوصاف کی حقیقت ان کے خالق کے سوا کوئی نہیں جانتا۔''

صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے بھی اپنی ہمت و وسعت کے موافق آپ ﷺ کے حلیہ مبارک اور حسن و جمال کو بیان کیا — اس مضمون میں ہم نبی آخرالزمان حضرت محمد ﷺ کے حلیہ مبارک اور حسن و جمال کو احادیث مبارکہ اور صحابہ کرامؓ کے اقوال کی روشنی میں بیان کرنے کی سعادت حاصل کریں گے۔ **وما توفیقی الا باللہ!**

نبی اکرم ﷺ کا قد وقامت

آپ ﷺ کے قد وقامت کے بارے میں روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ نہ بہت زیادہ لمبے تھے اور نہ بہت زیادہ کوتاہ قد' بلکہ آپؐ درمیانے قد کے تھے' جسے انگریزی میں ideal height کہتے ہیں۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ نے آپؐ کے قد وقامت کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ لَيْسَ بِالطَّوِيْلِ الْبَائِنِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ (شمائل ترمذی' ح ۱)

''رسول اللہ ﷺ نہ بہت زیادہ لمبے قد کے تھے اور نہ بہت زیادہ کوتاہ قد (بلکہ آپؐ درمیانے قد کے تھے)۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی دوسری حدیث میں ''رَبْعَةً'' (درمیانہ قد) کا لفظ مذکور ہے:

كَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ رَبْعَةً وَلَيْسَ بِالطَّوِيْلِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ (شمائل ترمذی' ح ۲)

''رسول اللہ ﷺ درمیانے قد کے تھے بایں معنی کہ نہ بہت زیادہ لمبے تھے اور نہ بہت زیادہ کوتاہ قد۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے قد مبارک کی کیفیت کو ان الفاظ میں بیان کیا:

لَمْ يَكُنْ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ بِالطَّوِيْلِ الْمُمَّغِطِ وَلَا بِالْقَصِيْرِ الْمُتَرَدِّدِ وَكَانَ

رَبْعَةً مِنَ الْقَوْمِ (شمائل ترمذی' ح ٦)

''رسول اللہ ﷺ نہ بہت زیادہ لمبے تھے اور نہ بہت زیادہ پست قد' بلکہ آپؐ درمیانہ قد لوگوں میں سے تھے۔''

امام بیہقیؒ کی بیان کردہ ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ﷺ کا قد مبارک لمبائی کی طرف مائل تھا:

وَاِنَّهٗ كَانَ اِلَى الطُّوْلِ اَقْرَبُ (رواه البيهقى فى شعب الايمان)

''اور آپؐ لمبائی کی طرف مائل تھے۔''

اس بات کی تائید ان الفاظ سے بھی ہوتی ہے جن سے حضرت ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ نے آپ ﷺ کے قد مبارک کی کیفیت کو بیان کیا ہے:

كَانَ .....اَطْوَلَ مِنَ الْمَرْبُوْعِ وَاَقْصَرَ مِنَ الْمُشَذَّبِ (شمائل ترمذی' ح ۷)

''(رسول اللہ ﷺ کا قد) درمیانے قد والے سے لمبا اور بہت زیادہ لمبے سے چھوٹا تھا۔''

روایات میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے ساتھ چلتے تھے تو سب سے دراز قد نظر آتے تھے — محدثین کرام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ آپ ﷺ کا صحابہ میں لمبا نظر آنا' آپؐ کے درازیٔ قد کی وجہ سے نہیں تھا بلکہ یہ آپؐ کا معجزہ تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ کمالاتِ معنوی کی طرح کوئی آپؐ سے صورتِ ظاہری میں بھی غالب محسوس نہ ہو۔

نبی اکرم ﷺ کی چال مبارک

نبی اکرم ﷺ باوقار اور عزت مندانہ انداز میں چلتے تھے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: **اِذَا مَشٰى يَتَكَفَّأُ** ''(نبی اکرم ﷺ) جب چلتے تو ایسا معلوم ہوتا جیسا ڈھلوان کی طرف اتر رہے ہیں۔''

مولانا عبدالقیوم حقانی حدیث مبارکہ کے اس جملہ کی تشریح میں رقم طراز ہیں:

''یتکفأ کے تین معانی نقل ہوئے ہیں: (۱) تیزی سے چلنا (۲) آگے کی طرف جھک کر چلنا (۳) قدم اٹھا کر چلنا۔ حضور اقدس ﷺ کی رفتار مبارک میں یہ تینوں اوصاف بدرجہ اتم موجود تھے۔ یہ تینوں صفات عجز وانکسار اور تواضع وعبدیت پر دلالت کرتے ہیں۔ آپ ﷺ کی رفتار میں غرور یا تکبر کا شائبہ تک نہ ہوتا تھا۔ کشادہ کشادہ قدم اُٹھاتے' سینہ تان کر اکڑ کر نہ چلتے' نہایت ہی باوقار' عزت مندانہ اور پسندیدہ چال چلتے تھے۔'' (شرح شمائل ترمذی' ج ۱' ص ۴۹)

نبی اکرم ﷺ کی جسمانی ساخت

اس عنوان کے تحت نبی اکرم ﷺ کی جسمانی ساخت کو بیان کیا جائے گا کہ آپ ﷺ کے جسمانی اعضاء کی کیفیت کیا تھی۔

(۱) کندھوں کے درمیان زیادہ چوڑائی: نبی اکرم ﷺ کے کندھوں کے درمیان چوڑائی کچھ زیادہ تھی جو مردانگی کی علامت ہے: بُعَيْدَ مَا بَيْنَ مَنْكِبَيْنِ ''(نبی اکرم ﷺ کے) کندھوں کے درمیان کا حصہ ذرا زیادہ چوڑا تھا۔''

(۲) پُرگوشت ہتھیلیاں اور قدمین: نبی اکرم ﷺ کی ہتھیلیاں اور قدمین مبارک پُرگوشت تھے جو مردوں کے لیے قابلِ تعریف صفت اور قوت و شجاعت کی علامت ہے: شَثْنُ الْكَفَّيْنِ وَالْقَدَمَيْنِ ''(نبی اکرم ﷺ کی) ہتھیلیاں اور دونوں پاؤں پُرگوشت تھے۔''

(۳) اعضاء کے جوڑ کی ہڈیاں: نبی اکرم ﷺ کے اعضاء مبارک کے جوڑ کی ہڈیاں ذرا بڑی تھیں۔ یہ بھی شجاعت کی علامت ہے: ضَخْمُ الْكَرَادِيْسِ ''(نبی اکرم ﷺ کے) اعضاء مبارک کے جوڑ کی ہڈیاں بڑی تھیں۔''

(۴) سر مبارک بھی قدرے بڑا تھا: نبی اکرم ﷺ کی جسمانی ساخت چوڑائی کی طرف مائل تھی۔ اسی مناسبت سے آپ ﷺ کا سر مبارک بھی اعتدال کے ساتھ قدرے بڑا تھا جو آپ کے جسمانی ساخت کے عین مطابق تھا: ضَخْمُ الرَّأْسِ ''(نبی اکرم ﷺ کا) سر مبارک بھی اعتدال کے ساتھ بڑا تھا''۔ قاضی محمد عاقل اس بارے میں لکھتے ہیں کہ یہ دماغ کے قوی ترین ہونے کی کامل ترین علامت ہے جو کہ فہم و فراست کی زیادتی کا سبب ہے اور اس میں بے شمار فائدے ہیں۔ ملا علی قاری نے اس بارے میں لکھا ہے کہ یہ قوی اور کامل ترین دماغ کی علامت ہے جو آپ ﷺ کو دوسرے انسانوں سے ممتاز کرتی ہے۔

(۵) نبی اکرم ﷺ موٹے بدن والے نہ تھے: اگرچہ نبی آخر الزمان ﷺ کا جسم مبارک چوڑا تھا، لیکن آپ پر موٹاپا ہرگز نہیں تھا جو سستی کی علامت ہوتا ہے: وَلَمْ يَكُنْ بِالْمُطَهَّمِ ''(نبی اکرم ﷺ) موٹے بدن والے نہ تھے۔''

(۶) جسم مبارک پر غیر ضروری بال نہیں تھے: نبی اکرم ﷺ کے جسم پر غیر ضروری بال نہیں تھے۔ یعنی بازو اور پنڈلیوں اور خاص خاص حصوں کے علاوہ غیر ضروری بال نہیں تھے: اَجْرَدُ ذُوْ مَسْرُبَةٍ ''(نبی اکرم ﷺ کے) بدن پر (معمولی طور سے زائد) بال نہیں تھے، بس سینہ

مبارک سے لے کر ناف تک بالوں کی ایک لکیر تھی۔''

نبی اکرم ﷺ کا سینہ مبارک

نبی اکرم ﷺ فراخ، کشادہ اور ہموار سینہ والے تھے۔ سینہ کا کوئی بھی حصہ دوسرے سے بڑھا ہوا نہیں تھا۔ امام بیہقیؒ نے نبی کریم ﷺ کے سینہ مبارک کی بڑی پیاری تعبیر کی ہے:

وكان عريض الصدر ممسوحه كانه المرايا فى شدتها واستوائها ، لا يعلو بعض لحمه بعضاً ، على بياض القمر ليلة البدر (دلائل النبوة، ج ۱، ص ۳۰۴)

''رسول اللہ ﷺ کا سینہ اقدس فراخ و کشادہ اور آئینہ کی طرح سخت اور ہموار تھا۔ کوئی حصہ دوسرے سے بڑھا ہوا نہیں تھا اور سفیدی میں چودھویں کے چاند کی طرح تھا۔''

نبی اکرم ﷺ کی رنگت

روایات کے مطابق نبی اکرم ﷺ کی رنگت چونے کی طرح سفید نہیں تھی اور نہ اتنی گندمی تھی کہ سانولا پن آ جائے، بلکہ آپ ﷺ کی رنگت ہلکی سی گندمی تھی اور آپؐ چودھویں رات کے چاند سے زیادہ روشن اور پُرنور تھے۔ احادیث کے الفاظ درج ذیل ہیں:

وَلَا بِالْاَبْيَضِ الْاَمْهَقِ وَلَا بِالْاٰدَمِ (شمائل ترمذی، ح ۱)

''اور (آپ ﷺ رنگت کے اعتبار سے) نہ بہت زیادہ سفید تھے اور نہ بہت زیادہ گندم گوں (بلکہ آپؐ ہلکے سے گندمی رنگ کے تھے)۔''

اَسْمَرَ اللَّوْن ''(آپ ﷺ) ہلکے گندمی رنگ کے تھے۔''

نبی اکرم ﷺ کی رنگت سفیدی اور سرخی کا حسین امتزاج تھی۔ ایک آدمی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کہا: اے امیر المؤمنین! ہمیں نبی مکرم ﷺ کا حلیہ بتائیے۔ حضرت علیؓ نے فرمایا:

كَانَ اَبْيَضَ مُشْرَبًا حُمْرَةً (رواه البيهقى فى دلائل النبوة، ج ۱، ص ۲۱۷)

''آپ ﷺ کی رنگت سفیدی اور سرخی کا حسین امتزاج تھی۔''

حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے الفاظ ہیں:

كَانَ اَبْيَضَ بَيَاضُهٗ اِلَى السُّمْرَةِ (دلائل النبوة، ج ۱، ص ۲۱۷)

''(نبی مکرم ﷺ) سفید رنگت والے تھے ایسی سفیدی جو سرخی کی طرف مائل تھی۔''

نمایاں حسنِ یوسف میں سفیدی تھی، صباحت تھی
یہاں سرخی تھی، گلگوں رنگ تھا جس میں ملاحت تھی

آپ ﷺ رنگت کے اعتبار سے تمام لوگوں سے زیادہ پُرنور، روشن اور پُرکشش تھے:

وَكَانَ اَحْسَنَ النَّاسِ وَجْهًا وَ اَنْوَرَهُمْ لَوْنًا (دلائل النبوۃ، ج ۱، ص ۳۰۰)

''(نبی اکرم ﷺ) چہرے کے اعتبار سے سب سے زیادہ خوبصورت اور رنگت کے اعتبار سے تمام لوگوں سے زیادہ پُرنور تھے۔''

نبی اکرم ﷺ کا چہرہ مبارک

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نبی مکرم ﷺ کے چہرۂ انور کو قرآن کے اوراق سے تشبیہ دیا کرتے تھے۔ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ وفات سے چند دن پہلے ہم حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی امامت میں نماز ادا کر رہے تھے کہ آپ ﷺ نے پردہ ہٹا کر ہماری طرف دیکھا:

كَاَنَّ وَجْهَهُ وَرَقَةُ مُصْحَفٍ (رواہ البخاری و مسلم)

''گویا آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک قرآن کے ورق کی طرح تھا۔''

نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ مبارک کی کیفیت یہ تھی کہ نہ تو بہت زیادہ گول تھا اور نہ بہت زیادہ لمبا، بلکہ آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک دونوں کے درمیان تھا، یعنی گولائی اور لمبائی کے اعتبار سے اعتدال پر تھا۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

وَلَا بِالْمُكَلْثَمِ وَكَانَ فِيْ وَجْهِهٖ تَدْوِيْرٌ (شمائل ترمذی، ح ۶)

''آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک بالکل گول نہ تھا، البتہ آپؐ کے چہرۂ مبارک میں تھوڑی سی گولائی موجود تھی۔''

چہرۂ مبارک: مثل القمر، بل فوق القمر

نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ مبارک کی تعبیر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے چودھویں رات کے چاند سے دی ہے جو روشنی اور نور میں نہایا ہوتا ہے، لیکن یہ تشبیہات تقریبی اور بطور مثال کے ہیں، ورنہ آپ ﷺ کا چہرۂ مبارک ایک چاند تو کیا ایسے ہزاروں چاند سے زیادہ منوّر تھا۔ ابواسحٰق کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ سے پوچھا:

أَكَانَ وَجْهُ النَّبِيِّ ﷺ مِثْلَ السَّيْفِ؟ قَالَ لَا بَلْ مِثْلَ الْقَمَرِ (صحیح البخاری)

''کیا نبی مکرم ﷺ کا چہرۂ مبارک تلوار کی طرح تھا؟ حضرت براء بن عازبؓ نے جواب دیا: نہیں، بلکہ چاند کی طرح روشن (گولائی لیے ہوا) تھا۔''

حضرت ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ مبارک کو پورے چاند کی روشنی

سے تشبیہ دی۔ فرماتے ہیں:

يَتَلَأْلَأُ وَجْهُهٗ تَلَأْلُؤَ الْقَمَرِ لَيْلَةَ الْبَدْرِ (شمائل ترمذی، ح ۷)

''(نبی اکرم ﷺ کا) چہرۂ مبارک چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکتا تھا۔''

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ جب بھی آپ ﷺ کے چہرۂ مبارک کو دیکھتے تو پکار اُٹھتے:

اَمِيْن مُصْطَفٰى لِلْخَيْرِ يَدْعُوْا كَضَوْءِ الْبَدْرِ زَايَلَهُ الظَّلَام

(بحوالہ دلائل النبوۃ)

''وہ برگزیدہ امین جو بھلائی کی دعوت دیتا ہے (اس کے چہرۂ مبارک کی تابانی ایسی ہے) جیسے اندھیرے میں بدرِ کامل ضوفشاں ہو۔''

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ جب آپ ﷺ کے چہرہ مبارک کو دیکھتے تو ان کی زبان پر زہیر بن ابی سلمٰی رضی اللہ عنہ کا شعر آجاتا (بحوالہ دلائل النبوۃ):

لَوْ كُنْتَ مِنْ شَيْءٍ سِوَى بَشَرٍ كُنْتَ الْمُضِيْءُ لَيْلَةَ الْبَدْرِ

''اگر آپؐ انسان کے سوا کچھ اور ہوتے تو پھر آپؐ چودھویں رات کا چاند ہوتے جو بہت روشن ہوتا ہے۔''

بعض صحابہ نے نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کو چمکتے ہوئے سورج سے تشبیہ دی ہے، مثلاً حضرت عمار بن یاسر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے ربیع بنت معوذ رضی اللہ عنہا سے کہا کہ مجھے رسول اللہ ﷺ کا حلیہ بتایئے تو آپؓ نے کہا:

لَوْ رَأَيْتَهٗ لَقُلْتَ: اَلشَّمْسُ طَالِعَةٌ (دلائل النبوۃ، ج ۱، ص ۲۰۰)

''اگر تو آپ ﷺ کو دیکھتا تو پکار اُٹھتا کہ آپؐ چمکتا ہوا سورج ہیں۔''

شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا رحمۃ اللہ علیہ اس بارے میں لکھتے ہیں:

''یہ تشبیہات سب تقریبی ہیں ورنہ ایک چاند کیا ہزار چاند بھی حضور اقدس ﷺ جیسا نور نہیں ہوسکتے۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے کہ اگر تجھے ممدوح کو عیب ہی لگانا ہے تو اسے چودھویں رات کے چاند سے تشبیہ دے دے، اس کے عیب لگانے کے لیے یہی کافی ہے۔'' (شرح شمائل ترمذی، ص ۲۵)

بقول شاعر (بحوالہ شرح شمائل ترمذی، مولانا محمد زکریا، ص ۱۸):

دیر و حرم میں روشنی شمس و قمر سے ہو تو کیا
مجھ کو تو تم پسند ہو اپنی نظر کو کیا کروں!

نبی اکرم ﷺ کی کشادہ پیشانی

نبی اکرم ﷺ کی پیشانی کشادہ تھی جو حسنِ خلق پر دلالت کرتی ہے: وَاسِعَ الْجَبِیْنِ ''(نبی اکرم ﷺ) کشادہ پیشانی والے تھے''۔ امام بیہقی کی نقل کردہ روایت کے الفاظ ہیں: کَانَ مُفَاضَ الْجَبِیْنِ (دلائل النبوۃ' ج ۱' ص ۲۱۴) ''(نبی اکرم ﷺ) کشادہ پیشانی والے تھے۔''

آپ ﷺ کی پیشانی مبارک تخلیقی طور پر طولاً و عرضاً کشادہ تھی اور تخلیقی طور پر پیشانی کا وسیع و کشادہ ہونا حسنِ خلق پر دلالت کرتا ہے۔ علامہ عبدالرؤف مناویؒ اس بارے میں فرماتے ہیں:

وسعة الجبين محمود عند كل ذى ذوق سليم

''کشادہ پیشانی ہونا ہر اچھا ذوق رکھنے والے کے نزدیک قابلِ تعریف صفت ہے۔''

حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے نبی اکرم ﷺ کی پیشانی کی اس کیفیت کو ایک شعر میں یوں بیان کیا ہے (بحوالہ دلائل النبوۃ):

مَتٰی یَبْدُ فِی الدَّاجِ الْبَهِیْمِ جَبِیْنُهٗ
یَلُحْ مِثْلَ مِصْبَاحُ الدُّجٰی الْمُتَوَقِّدِ

''رات کی تاریکی میں نبی اکرم ﷺ کی پیشانی مبارک اس طرح چمکتی تھی جیسے اندھیری رات میں چراغ۔''

نبی اکرم ﷺ کی سیاہ آنکھیں' دراز پلکیں اور باریک سیاہ اَبرو

نبی اکرم ﷺ کی آنکھیں سیاہ تھیں جو خوبصورتی کی علامت سمجھی جاتی ہیں: اَدْعَجُ الْعَیْنَیْنِ ''(نبی اکرم ﷺ کی) آنکھیں سیاہ مائل تھیں''۔ اس کے علاوہ آپ ﷺ کی آنکھوں کی سفیدی میں سرخ رنگ کے ڈورے پڑے ہوئے تھے جو آنکھوں کی انتہائی خوبصورتی کی علامت ہوتے ہیں: اَشْکَلُ الْعَیْنِ ''(نبی اکرم ﷺ کی) آنکھوں کی سفیدی میں سرخ ڈورے پڑے ہوئے تھے۔''

نبی اکرم ﷺ کی آنکھیں قدرتی طور پر کالی سیاہ تھیں اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دیکھتے تو اندازہ لگاتے کہ آپؐ نے سرمہ لگایا ہے حالانکہ آپؐ نے اُس وقت سرمہ نہیں لگایا ہوتا تھا۔ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ میں آپؐ کی آنکھوں کی طرف دیکھ کر اندازہ لگاتا:

أَکْحَلَ الْعَیْنَیْنِ وَلَیْسَ بِاَکْحَلٍ (دلائل النبوۃ' ج ۱' ص ۲۴۸)

''آپؐ نے سرمہ لگایا ہے حالانکہ آپؐ نے سرمہ نہیں لگایا ہوتا تھا۔''

نبی مکرم ﷺ کی نگاہیں خشوع و خضوع اور کثرتِ حیا و خوف کی وجہ سے زیادہ تر جھکی رہتی

تھیں اور عموماً آپؐ آنکھوں کے کناروں سے دیکھتے تھے' یعنی شرم و حیا کی وجہ سے آنکھ بھر کر نہیں دیکھتے تھے۔ حضرت ہند بن ابی ہالہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

خَافِضُ الطَّرْفِ نَظَرُهٗ اِلَی الْاَرْضِ اَکْثَرُ مِنْ نَظَرِهٖ اِلَی السَّمَاءِ جُلُّ نَظَرِهِ الْمُلَاحَظَةُ (شمائل ترمذی' ح ۷)

''(نبی اکرم ﷺ کی) نگاہیں عموماً جھکی رہتی تھیں اور آپؐ کی نگاہ بہ نسبت آسمان کے زمین کی طرف زیادہ رہتی تھی۔ آپؐ کی عادت آنکھوں کے کناروں سے دیکھنے کی تھی۔''

آپ ﷺ کی پلکیں دراز تھیں جو مردوں کے لیے قابلِ تعریف صفت ہے: اَهْدَبُ الْاَشْفَارِ ''(نبی اکرم ﷺ کی) پلکیں دراز تھیں''۔ جبکہ آپ ﷺ کے اَبرو مبارک گہرے سیاہ' گنجان اور کمان کی طرح سیدھے اور باریک تھے۔ حضرت ہند ابی ہالہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

اَزَجَّ الْحَوَاجِبِ سَوَابِغَ مِنْ غَیْرِ قَرَنٍ بَیْنَهُمَا عِرْقٌ یَدُرُّهُ الْغَضَبُ (ایضاً' ح ۷)

''آپؐ کے ابرو مبارک خمدار' باریک اور گنجان تھے۔ دونوں ابرو جدا جدا تھے جو آپس میں ملتے نہیں تھے۔ ان کے درمیان ایک رگ تھی جو غصہ کے وقت اُبھر جاتی تھی۔''

نبی اکرم ﷺ کی فراخ دہنی

نبی اکرم ﷺ فراخ دہن تھے اور اہلِ عرب مرد کے لیے فراخ دہنی کو بہت پسندیدہ سمجھتے تھے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: ضَلِیْعَ الْفَمِ ''(نبی اکرم ﷺ) فراخ دہن تھے۔''

مولانا عبدالقیوم حقانی اس بارے میں رقم طراز ہیں:

''یہ وسعتِ فم رجال میں محمود ہے اور خواتین میں مذموم ہے۔ دہن مبارک کشادہ تھا نہ چھوٹا اور تنگ تھا کہ منہ سے نکلی ہوئی بات میں فصاحت نہ رہتی اور نہ اعتدال و موزونیت سے بڑا تھا کہ بھدّا نظر آتا۔ موزوں' معتدل اور مناسب کشادہ دہن سے موصوف تھے جو ایک عمدہ اور اچھی صفت ہے۔'' (شرح شمائل ترمذی' ج ۱' ص ۱۰۴)

نبی اکرم ﷺ کے دندانِ مبارک

نبی اکرم ﷺ کے دانت مبارک باریک اور چمکدار تھے اور سامنے والوں دانتوں میں ذرا فصل تھا۔ جب بات کرتے تھے تو اس میں سے نور نکلتا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما نبی اکرم ﷺ کے دانتوں کی کیفیت بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

کَانَ رَسُوْلُ اللّٰهِ ﷺ اَفْلَجَ الثَّنِیَّتَیْنِ اِذَا تَکَلَّمَ رُءِیَ کَالنُّوْرِ یَخْرُجُ مِنْ

بَيْنِ ثَنَايَاهُ (رواه الدارمی والترمذی فی الشمائل' ح ١٤)

''رسول اللہ ﷺ کے اگلے دانت مبارک کچھ کشادہ تھے۔ جب آپؐ بات کرتے تو ایک نور سا ظاہر ہوتا جو دانتوں کے درمیان سے نکلتا تھا۔''

علماء کرام کے نزدیک مشہور یہی ہے کہ آپ ﷺ کا کلام' جو دانتوں کے درمیان سے نکلتا تھا' کو نور سے تشبیہہ دی گئی ہے لیکن علامہ مناویؒ کی رائے یہ ہے کہ یہ کلام سے تشبیہہ نہیں ہے بلکہ یہ نور حسّی تھا جو بطور معجزہ نبی آخرالزماں ﷺ کے دانتوں سے نکلتا تھا۔

امام بوصیریؒ نے آپ ﷺ کے دانتوں کو ایک شعر میں ایسے موتی سے تشبیہہ دی ہے جو ابھی سیپ سے باہر نہ نکلا ہو:؎

كانما اللؤلؤ المكنون فی صدف من معدنی منطق منه و متبسم

نبی اکرم ﷺ کی ناک مبارک

نبی اکرم ﷺ کی ناک مبارک باریک' بلندی کی طرف مائل اور نور سے منور تھی۔ حضرت ہند بن ابی ہالہ ؓ فرماتے ہیں:

اَقْنَى الْعِرْنَيْنِ لَهُ نُوْرٌ يَّعْلُوْهُ يَحْسِبُهُ مَنْ لَمْ يَتَأَمَّلْهُ اَشَمَّ (شمائل ترمذی' ح٧)

''آپ ﷺ کی ناک مبارک بلندی مائل تھی اور اس پر ایک نور تھا۔ پہلی دفعہ دیکھنے والا آپؐ کو بہت بلند ناک والا سمجھتا' حالانکہ ناک مبارک بہت بلند نہیں تھی (بلکہ حسن و چمک کی وجہ سے بلند معلوم ہوتی تھی)۔''

نبی اکرم ﷺ کے رخسار مبارک

نبی اکرم ﷺ کے رخسار مبارک نہ بہت زیادہ اُبھرے ہوئے تھے اور نہ بہت زیادہ دھنسے ہوئے تھے بلکہ اعتدال اور توازن کا دلکش نمونہ تھے۔ ان میں ایسی سرخی مائل سفیدی تھی کہ گلاب کو پسینہ آجائے' ایسی چمک تھی کہ چاند بھی شرما جائے' ایسی گدازی تھی کہ شبنم بھی پانی بھرتی دکھائی دے اور ایسی نرماہٹ تھی کہ کلیوں کو بھی حجاب آئے۔ حدیث کے الفاظ ہیں: سَهْلَ الْخَدَّيْنِ ''(نبی اکرم ﷺ) نرم گداز رخسار والے تھے۔''

نبی اکرم ﷺ کی گردن مبارک

نبی اکرم ﷺ کی گردن مبارک اعتدال کے ساتھ لمبی اور بہت خوبصورت تھی۔ حضرت

ہند بن ابی ہالہ ؓ نے آپؐ کی گردن مبارک کو حسین و جمیل مورتی کی گردن سے تشبیہہ دی ہے۔ یہ تشبیہہ بھی صرف فرضی ہے' ورنہ آپ ﷺ کے اعضاء کو کسی بھی چیز کے ساتھ تشبیہہ دینا آپؐ پر عیب لگانے کے مترادف ہے۔ حدیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

كَاَنَّ عُنُقَهٗ جِيْدُ دُمْيَةٍ فِيْ صَفَاءِ الْفِضَّةِ (شمائل ترمذی' ح٨)

''(نبی اکرم ﷺ کی گردن ایسی خوبصورت اور باریک تھی) جیسا کہ مورتی کی گردن صاف تراشی ہوئی ہوتی ہے (اور رنگت میں) چاندی کی طرح پُرنور تھی۔''

مولانا عبدالقیوم حقانی اس بارے میں لکھتے ہیں:

''عادتِ انسانی بھی تو یہ ہے کہ اپنے محبوب کو حسن کی تصویر سے تشبیہہ دیا کرتے ہیں' چنانچہ زمانہ قدیم میں پتھر سے خوبصورت گڑیاں' مورتیاں اور پتلیاں بنائی جاتی تھیں..... متنبّی نے بھی اپنے محبوب کی تعریف میں کہا ہے: صنمًا من الاصنام لولا الروح ''اگر میرے محبوب میں زندگی کی روح نہ ہوتی تو ایک حسین مجسمہ معلوم ہوتا''۔ یہاں بھی حضور اقدس ﷺ کے بارے میں کہا گیا ہے کہ آپؐ کی گردن مبارک کسی خوبصورت مورتی کی طرح حسین تھی۔'' (شرح شمائل ترمذی' ج ١' ص ١٠٥)

امام بیہقیؒ نے نبی کریم ﷺ کی گردن مبارک کی بہت پیارے الفاظ میں تشریح کی ہے' وہ لکھتے ہیں:

وكان احسن عباد الله عنقا' لا ينسب الى الطول ولا الى القصر' ما ظهر من عنقه للشمس والرياح فكانه ابريق فضة' يشوب ذهبا يتلأ لأ فی بياض الفضة وحمرة الذهب' وما غيب الثياب من عنقه ما تحتها فكانه القمر ليلة البدر (دلائل النبوة' ج ١' ص ٣٠٤)

''آپ ﷺ کی گردن مبارک تمام مخلوقاتِ خدا میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی۔ نہ بہت زیادہ لمبی تھی اور نہ بہت زیادہ چھوٹی۔ گردن کی پیٹھ جہاں سورج کی روشنی اور ہوا کا گزر ہوتا تھا وہ گویا چاندی کا ٹکڑا تھی۔ آپؐ کی گردن چاندی کی سفیدی اور سونے کی سرخی سے زیادہ روشن اور خوصورت تھی۔ اور گردن کا وہ حصہ جس پر کپڑا نہیں ہوتا تھا وہ تو گویا چودھویں رات کا چاند تھا۔''

نبی اکرم ﷺ کے بالوں کی کیفیت

رسول اللہ ﷺ کے مبارک بالوں کی کیفیت کے بارے میں احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کے بال نہ تو بالکل سیدھے تھے اور نہ اتنے پیچدار کہ جنہیں گھونگریالے کہا جا سکے' بلکہ

آپؐ کے بال مبارک ہلکے سے گھونگر یالے تھے۔احادیث کے الفاظ ملاحظہ ہوں:

وَكَانَ شَعْرُهٗ لَيْسَ بِجَعْدٍ وَلَا سَبْطٍ (شمائل ترمذی' ح۲)

''آپ ﷺ کے بال نہ بالکل سیدھے تھے اور نہ بالکل پیچدار۔''

وَلَمْ يَكُنْ بِالْجَعْدِ الْقَطَطِ وَلَا بِالسَّبْطِ ' كَانَ جَعْدًا رَجِلًا (ایضاً' ح٦)

''(رسول اللہ ﷺ کے) بال نہ تو بالکل سیدھے تھے اور نہ بالکل پیچدار' بلکہ تھوڑی سی پیچیدگی لیے ہوئے تھے۔''

نبی اکرم ﷺ کے بالوں کی مانگ

حضور اکرم ﷺ کے بالوں کی مانگ کے بارے میں روایات دو طرح کی ہیں' ایک میں آپ ﷺ کے قصداً مانگ نکالنے کا تذکرہ ہے جبکہ دوسری روایات میں ہے کہ آپؐ مانگ نکالنے کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔اس کے بارے میں علماء نے لکھا ہے کہ دوسری قسم کی روایات ابتدائے زمانہ پر محمول ہیں کہ اولاً نبی اکرم ﷺ مشرکینِ مکہ کی مخالفت اور اہلِ کتاب کی موافقت کی وجہ سے مانگ نکالنے کا اہتمام نہیں کرتے تھے۔بعد میں نبی اکرم ﷺ مانگ نکالنے کا قصداً اہتمام کرتے تھے۔حدیث کے الفاظ یوں ہیں:

اِنِ انْفَرَقَتْ عَقِيْقَتَهٗ فَرَقَهَا وَاِلَّا فَلَا (شمائل ترمذی' ح۷)

''اگر سر کے بالوں میں خود مانگ نکل آتی تو مانگ رہنے دیتے ورنہ (آپؐ خود مانگ نکالنے کا اہتمام) نہ کرتے۔''

حضرت عبداللہ بن عباس ؓ کی روایت میں نبی اکرم ﷺ کے مانگ نکالنے اور نہ نکالنے کے حوالے سے کافی تفصیل موجود ہے۔وہ فرماتے ہیں:

كَانَ النَّبِيُّ ﷺ يُحِبُّ مُوَافَقَةَ اَهْلِ الْكِتَابِ فِيْمَا لَمْ يُؤْمَرْ فِيْهِ ' وَكَانَ اَهْلُ الْكِتَابِ يَسْدِلُوْنَ اَشْعَارَهُمْ وَكَانَ الْمُشْرِكُوْنَ يَفْرُقُوْنَ رُؤُوْسَهُمْ فَسَدَلَ النَّبِيُّ ﷺ نَاصِيَتَهٗ ثُمَّ فَرَقَ بَعْدُ (بخاری و مسلم)

''رسول اللہ ﷺ ان کاموں میں اہلِ کتاب (یہود و نصاریٰ) کی موافقت پسند کرتے تھے جن میں اللہ کی طرف سے کوئی حکم نہ آیا ہو۔اہلِ کتاب اپنے بالوں کی مانگ نہیں نکالتے تھے جبکہ مشرکین مانگ نکالتے تھے۔رسول اللہ ﷺ اپنے بالوں کو پیشانی پر ڈال دیتے یعنی مانگ نہ نکالتے۔پھر بعد میں مانگ نکالنی شروع کر دی۔''

نبی اکرم ﷺ کے بالوں کی لمبائی

حضور اکرم ﷺ کے بالوں کی لمبائی کے بارے میں روایات مختلف ہیں' بعض میں بالوں کی لمبائی کندھوں تک (جُمّہ)' بعض میں گردن تک (لِمّہ) اور بعض میں کانوں کی لو تک (وَفْرَہ) کا ذکر ہے۔احادیث کے الفاظ درج ذیل ہیں:

لَهٗ شَعْرٌ يَضْرِبُ مَنْكِبَيْهِ (شمائل ترمذی' ح ٤)

''آپ ﷺ کے بال کندھوں تک آتے تھے۔''

عَظِيْمَ الْجُمَّةِ اِلٰى شَحْمَةِ اُذُنَيْهِ (شمائل ترمذی' ح۳)

''آپ ﷺ گنجان بالوں والے تھے جو کانوں کی لو تک آتے تھے۔''

يُجَاوِزُ شَعْرُهٗ شَحْمَةَ اُذُنَيْهِ اِذَا هُوَ وَفَّرَهٗ (شمائل ترمذی' ح۷)

''جب آپؐ کے بال مبارک زیادہ ہوتے تو کان کی لو سے متجاوز ہو جاتے تھے۔''

مولانا محمد زکریاؒ نبی اکرم ﷺ کے بالوں کے حوالے سے اختلاف کے بارے میں لکھتے ہیں:

''حقیقت میں کوئی اختلاف نہیں ہے' اس لیے کہ بال ایک حالت پر نہیں رہا کرتے' کبھی کم ہوتے ہیں کبھی زائد ہو جاتے ہیں۔اور قصداً بھی کم کیے جاتے ہیں' کبھی بڑھائے جاتے ہیں۔'' (شرح شمائل ترمذی' ص۱۵)

بعض شارحین نے ان کی تطبیق یہ کی ہے کہ جب آپؐ بال بنواتے تو کانوں کی لو تک ہوتے' کبھی ایک ماہ تک بال نہ بنواتے تو گردن تک پہنچ جاتے اور کبھی حالات کے مطابق (یعنی جب حالاتِ سفر میں ہوتے تو) کئی کئی ماہ تک بال نہ بنواتے تو کندھوں تک پہنچ جاتے۔

نبی اکرم ﷺ کی داڑھی مبارک

نبی مکرم ﷺ کی داڑھی مبارک گھنی اور گنجان تھی اور بالوں کا رنگ سیاہ تھا۔حدیث کے الفاظ ہیں: **كَثُّ اللِّحْيَةِ** ''(نبی اکرم ﷺ) گھنی داڑھی والے تھے''۔**اَسْوَدَ اللِّحْيَةِ** (دلائل النبوۃ' ج۱' ص۲۱۷) ''(نبی اکرم ﷺ) کی داڑھی کے بال سیاہ تھے۔''

نبی اکرم ﷺ کی مہر نبوت

اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر نبی کو کچھ نہ کچھ امتیازات دیے ہیں جو انہیں عام لوگوں سے ممتاز کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ ﷺ کو سب سے بڑھ کر امتیاز عطا فرمایا کہ آپؐ کے کندھوں کے درمیان مہرِ نبوت ثبت کر دی جو ختمِ نبوت کی تصدیق کرتی ہے۔یہ مہر نبوت رسولی کی

طرح تھی جس پر بال تھے۔ حضرت سائب بن یزید رضی اللہ عنہ اپنے بچپن کے واقعہ کا ذکر کرتے ہیں کہ میری خالہ مجھے دم کرانے کے لیے رسول اللہ ﷺ کے پاس لے گئیں۔ رسول اللہ ﷺ نے میرے سر پر ہاتھ پھیرا' میرے لیے برکت کی دعا کی اور میں نے آپؐ کے وضو کا بچا ہوا پانی پیا:

ثُمَّ قُمْتُ خَلْفَ ظَهْرِهٖ فَنَظَرْتُ اِلٰى خَاتَمِ النُّبُوَّةِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ مِثْلَ زِرِّ الْحَجَلَةِ (رواه البخاری و مسلم)

''پھر میں آپؐ کے پیچھے کھڑا ہوا' پس میں نے کندھوں کے درمیان مہر نبوت کو دیکھا جو مسہری کی گھنڈیوں کی طرح تھی۔''

حضرت علی رضی اللہ عنہ نے مہر نبوت کو ختم نبوت کی علامت قرار دیا ہے' وہ فرماتے ہیں:

بَيْنَ كَتِفَيْهِ خَاتَمُ النُّبُوَّةِ وَهُوَ خَاتَمُ النَّبِيِّيْنَ (سنن الترمذی)

''آپ ﷺ کے کندھوں کے درمیان مہر نبوت تھی اور آپؐ آخری نبی ہیں۔''

حضرت عبداللہ بن سرجس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

فَنَظَرْتُ اِلٰى خَاتَمِ النُّبُوَّةِ بَيْنَ كَتِفَيْهِ عِنْدَ نَاغِضِ كَتِفِهِ الْيُسْرٰى (مسلم)

''میں نے کندھوں کے درمیان مہر نبوت کو دیکھا۔ میرے مطابق وہ بائیں کندھے کی ہڈی کے قریب تھی۔''

نہ کوئی آپ ﷺ سا ہوگا' نہ کوئی آپؐ جیسا تھا!

نبی اکرم ﷺ کا حلیہ مبارک اور حسن و جمال ایسا کامل تھا کہ آپ اک شاہکار نظر آتے تھے جسے اس کے خالق نے بڑی محبت اور چاہت سے تخلیق کے سانچے میں ڈھالا تھا ع ''وہ اِک شہکارِ فطرت جس پہ خود خالق کو پیار آئے''۔ آپ ﷺ کے جسم کا ہر عضو اور حصہ کمالِ حسن کو پہنچا ہوا تھا۔ کسی ذی روح نے آپؐ جیسا نہ آپؐ سے پہلے کبھی دیکھا اور نہ قیامت تک دیکھ سکے گا' اس لیے کہ آپؐ ہر اعتبار سے حسن کی انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔ جس نے بھی آپؐ کو دیکھا وہ بلا اختیار پکار اٹھا کہ ہم نے اس سے پہلے حسن و جمال کا ایسا پیکر کبھی نہیں دیکھا۔

☆ حضرت براء بن عازب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

مَارَاَيْتُ شَيْئًا قَطُّ اَحْسَنَ مِنْهُ (شمائل ترمذی' ح۳)

''میں نے آپ ﷺ سے زیادہ حسین کوئی چیز (چاہے انسان ہو یا غیر انسان) نہیں دیکھی۔''

☆ حضرت علی رضی اللہ عنہ جنہوں نے بچپن بھی آپؐ کے ساتھ گزارا' فرماتے ہیں:

لَمْ اَرَ قَبْلَهٗ وَلَا بَعْدَهٗ مِثْلَهٗ (شمائل ترمذی' ح۵)

''میں نے نبی اکرم ﷺ جیسا نہ آپ سے پہلے دیکھا اور نہ آپ کے بعد۔''

☆ حضرت جابر بن سمرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

رَاَيْتُ رَسُوْلَ اللّٰهِ ﷺ فِيْ لَيْلَةٍ اَضْحِيَانٍ وَعَلَيْهِ حُلَّةٌ حَمْرَاءُ فَجَعَلْتُ اَنْظُرُ اِلَيْهِ وَاِلَى الْقَمَرِ فَلَهُوَ عِنْدِيْ اَحْسَنُ مِنَ الْقَمَرِ (شمائل ترمذی' ح۹)

''میں ایک مرتبہ چاندنی رات میں رسول اللہ ﷺ کو دیکھ رہا تھا اور آپؐ سرخ جوڑا زیب تن فرمائے ہوئے تھے۔ میں کبھی آپؐ کی طرف دیکھتا اور کبھی چاند کی طرف (یعنی میں فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ ان دونوں میں سے کون زیادہ خوبصورت ہے؟ بالآخر میں نے یہ فیصلہ کیا کہ) آپؐ چاند سے بھی کہیں زیادہ جمیل و حسین اور منور ہیں۔''

☆ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

مَا رَأَيْتُ شَيْئًا أَحْسَنَ مِنَ النَّبِيِّ ﷺ كَاَنَّ الشَّمْسَ تَجْرِيْ فِيْ وَجْهِهٖ

(رواه البيهقی' دلائل النبوة' ج۱' ص۲۰۹)

''میں نے نبی مکرم ﷺ سے زیادہ حسین کوئی نہیں دیکھا گویا ان کے چہرہ میں چمکتا سورج چلتا ہے۔''

☆ اُمّ المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے فرمایا:

لَرَاى زَلِيْخَا لَوْ رَاَيْنَ جَبِيْنَهٗ
لَاَثَرْنَ بِقَطْعِ الْقُلُوْبِ عَلَى الْيَدِ

(شرح شمائل ترمذی' مولانا عبدالقیوم حقانی' ج۱۱' ص۶۶)

''زلیخا کی سہیلیاں (جنہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن کو دیکھ کر اپنے ہاتھوں کو کاٹ لیا تھا) اگر نبی اکرم ﷺ کے چہرۂ انور کو دیکھ لیتیں تو ہاتھوں کے بجائے دلوں کو کاٹ لیتیں۔''

نہ کوئی آپؐ سا ہوگا نہ کوئی آپؐ جیسا تھا
کوئی یوسفؑ سے پوچھے مصطفیٰؐ کا حسن کیسا تھا

☆ نبی اکرم ﷺ کے حسن کی جو تعبیر شاعرِ رسول حضرت حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ نے کی ہے وہ کسی شاہکار سے کم نہیں ہے:

وَاَحْسَنَ مِنْكَ لَمْ تَرَ قَطُّ عَيْنِیْ
وَاَجْمَلَ مِنْكَ لَمْ تَلِدِ النِّسَاءُ
خُلِقْتَ مُبَرَّأً مِنْ كُلِّ عَيْبٍ
كَاَنَّكَ قَدْ خُلِقْتَ كَمَا تَشَاءُ

''آپؐ سے زیادہ حسین کسی آنکھ نے کبھی نہیں دیکھا اور نہ کسی ماں نے آپؐ سے زیادہ خوبصورت جنا ہے۔ آپؐ تو ہر عیب سے پاک پیدا کیے گئے ہیں گویا آپؐ نے جیسا چاہا ویسے ہی آپؐ کی تخلیق کر دی گئی۔'' (سبحان اللہ!)

☆ شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ نبی مکرم ﷺ کے بارے میں صحابہ کرامؓ کے اس قول: ''ہم نے آپؐ جیسا نہیں دیکھا'' کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''اس قسم کی عبارت سے کہ میں نے فلاں جیسا کبھی نہیں دیکھا' مبالغہ مقصود ہوا کرتا ہے اس کے مثل نہ ہونے میں' لیکن حضور ﷺ کے اوصاف میں مبالغہ نہیں اس لیے کہ وہاں کمالِ جمال ہی تعبیر سے باہر ہے۔ مناویؒ نے لکھا ہے کہ ہر شخص یہ اعتقاد رکھنے کا مکلّف ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا جسمِ مبارک جن اوصافِ جمیلہ کے ساتھ متّصف ہے کوئی دوسرا اُن اوصاف میں حضور ﷺ جیسا نہیں ہو سکتا۔ اور یہ محض اعتقادی چیز نہیں ہے' سیر' احادیث و تواریخ کی کتابیں اس سے لبریز ہیں کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے کمالاتِ باطنیہ کے ساتھ جمالِ ظاہری بھی علی الوجہ الاتم عطا فرمایا تھا۔'' (شرح شمائل ترمذی' ص ۱۶)

☆ شیخ ابراہیم بیجوریؒ نے نبی مکرم ﷺ کو سراپا حسن قرار دیتے ہوئے فرمایا:

''علماء محقّقین نے تصریح کی ہے کہ کمال ایمان کے معتقدات میں ایک اعتقاد یہ بھی ہے کہ جو کچھ حسنِ ظاہر' حضور سراپا حسن و جمال ﷺ کے وجود مبارک میں جمع کر دیا گیا ہے وہ کسی انسانی وجود میں ہرگز مجتمع نہیں ہوا باوجود اس اجتماع حسن ظاہری کے جو حسن آپؐ کا تھا' تمام کا تمام ظاہر نہیں ہوا کیونکہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں اتنی طاقت ہی نہیں تھی کہ وہ اس حسن کو جی بھر کر دیکھ سکتے۔'' (بحوالہ وسائل الوصائل الی شمائل الرسول' یوسف بن اسماعیل النبہانی' مترجم: محمد میاں صدیقی)

اختتامی کلمات

کچھ عنوانات ایسے ہوتے ہیں جن پر جتنا بھی لکھا جائے وہ کم بلکہ نہ ہونے کے برابر معلوم ہوتا ہے' مثلاً قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے اپنی شان کے حوالے سے فرمایا:

﴿قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّیْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّیْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ﴿۱۰۹﴾﴾ (الکھف)

''(اے نبی ﷺ!) کہہ دیجیے کہ اگر ہو جائے سمندر روشنائی میرے ربّ کے کلمات (لکھنے) کے لیے تو ختم ہو جائے گا سمندر پیشتر اس کے کہ ختم ہوں میرے ربّ کے کلمات۔ اور اگر ہم لے آئیں اس کے مثل اور روشنائی (تب بھی کلماتِ رب ختم نہ ہوں گے)۔''

اسی طرح نبی اکرم ﷺ کے اوصاف' مدح اور حسن و جمال بھی ایک ایسا ہی عنوان ہے جس کو بیان کرنا شروع کریں تو اوراق کم اور سیاہیاں ماند پڑ جائیں۔ بقول شاعر ؎

تھکی ہے فکرِ رسا اور مدح باقی ہے
قلم ہے آبلہ پا اور مدح باقی ہے
تمام عمر لکھا اور مدح باقی ہے
ورق تمام ہوا اور مدح باقی ہے!

اَللّٰھُمَّ صَلِّ وَسَلِّمْ عَلٰی سَیِّدِنَا مُحَمَّدٍ وَّاٰلِهٖ بِقَدْرِ حُسْنِهٖ وَ جَمَالِهٖ

اَخذ و استفادہ

☆ شمائل ترمذی' امام ترمذیؒ (جن احادیث مبارکہ کے ساتھ حوالہ درج نہیں ہے وہ شمائل ترمذی کے باب اول سے لی گئی ہیں۔)
☆ دلائل النبوۃ' امام بیہقیؒ
☆ وسائل الوصول الی شمائل الرسول' یوسف بن اسماعیل النبہانیؒ' مترجم: محمد میاں صدیقی
☆ شرح شمائل ترمذی' شیخ الحدیث مولانا محمد زکریاؒ
☆ شرح شمائل ترمذی' مولانا عبدالقیوم حقانی

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت' اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

شہادت فی سبیل اللہ

ضرورت‘ اہمیّت اور فضائل

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

اسلام چند مذہبی رسومات کا مجموعہ نہیں بلکہ یہ دین ہے‘ جس کی تعلیمات انسانی زندگی کے ہر پہلو پر روشنی ڈالتی ہیں۔ صرف ارکانِ اسلام پر عمل کر لینا اور دوسری اخلاقی اچھائیوں کو اختیار کر لینا کافی نہیں‘ بلکہ اسلام کا تقاضا یہ ہے کہ بنی آدم کا ہر فرد یہ حیاتِ مستعار اس طرح گزارے کہ وہ حقیقی کامیابی سے ہمکنار ہو کر ابدی راحت پالے۔ یہ ابدی راحت اس شخص کو ملے گی جو اول ایمان لا کر اسلام میں داخل ہو اور پھر رسول اللہ ﷺ کی زندگی کو مثال بنا کر اس کی پیروی میں اپنے شب و روز بسر کرے اور جان جان آفرین کے سپرد کر کے اگلی زندگی کا آغاز کرے۔

چونکہ نجات صرف اسلام میں منحصر ہے‘ اس لیے ہر مسلمان کے لیے ضروری ہے کہ وہ بنی نوعِ انسان کے ہر فرد کے بارے میں دلگیر اور فکرمند ہو اور کوشش کرے کہ وہ ایمان کی سلامتی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے تن تنہا اس مشن پر کام شروع کیا اور زندگی کے آخری سانس تک اس میں مصروف رہے۔ اس سلسلے میں جب آپ ﷺ نے اپنے ہم وطنوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کرتے ہوئے انہیں نجات کا راستہ دکھایا تو وہ آپ ﷺ کو خوش آمدید کہنے کے بجائے آپؐ کے جانی دشمن بن گئے۔ مگر آپؐ نے اپنی جدّوجہد جاری رکھی۔ آپ ﷺ کو مکّہ مکرّمہ میں چند ساتھی مل گئے‘ مگر کفار کی سختیاں اس قدر شدید تھیں کہ اہلِ ایمان کا مکہ میں رہنا ممکن نہ رہا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے مسلمانوں کو مدینہ منوّرہ ہجرت کر جانے کا حکم دیا اور خود بھی وہاں تشریف لے گئے۔ یہاں آ کر بھی آپؐ نے اپنا مشن جاری رکھا‘ جس کے نتیجے میں معتدبہ تعداد میں لوگ آپ کے ساتھی بن گئے اور مدینہ میں مسلمانوں کا غلبہ ہو گیا۔ یوں مسلمان مدینہ کے اندر اسلامی تعلیمات کے مطابق آزادی کے ساتھ عبادات بجالانے لگے‘ مگر یہ کافی نہ تھا۔ چنانچہ آپ ﷺ نے اردگرد کے قبائل کو نجات کے راستے کی طرف دعوت دی

اور ان کو اسلام پیش کیا‘ جن میں سے بیشتر نے اسلام قبول کر لیا۔ دوسروں کو آپ ﷺ نے فرمایا اگر اسلام قبول نہیں کرتے تو تمہیں ہماری سیادت میں چھوٹے بن کر رہنا ہوگا‘ ہم تمہارے مال و جان کی حفاظت کے ذمّہ دار ہوں گے‘ اور اگر یہ بھی قبول نہیں تو ہم یہ ہرگز گوارا نہیں کرتے کہ تم لوگ کفر کی حالت میں دنیا سے چلے جاؤ اور آخرت میں عذابِ الیم کا شکار ہو کر ہمیشہ کے لیے آگ میں جلتے رہو۔

رسول اللہ ﷺ اور آپؐ کے ساتھی اس مشن پر لگاتار شب و روز کام کرتے رہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ مدنی زندگی کے دس سال میں پورے جزیرہ نمائے عرب پر اسلام کا عَلَم لہرانے لگا اور کفر دُم دبا کر بھاگ گیا۔ مگر یہی مطلوب نہ تھا‘ بلکہ مطلوب و مقصود یہ تھا کہ نجات کا یہ نسخہ ہر فردِ بشر پر واضح کر دیا جائے۔ رسول اللہ ﷺ اسی مشن کے لیے مبعوث کیے گئے تھے۔ چنانچہ ۱۱ھ میں آپؐ کی وفات کے ساتھ اسلام کی پیش قدمی رکی نہیں‘ بلکہ آپؐ کے خلفائے راشدین اس مشن کو لے کر آگے بڑھتے گئے اور موجود دنیا کے بیشتر حصے پر اسلام کو غالب کر دکھایا۔ یہ کامیابی جہاد و قتال کے ذریعے عمل میں آئی۔ جب کفر کو اسلام کی سبقت نہ بھائے اور وہ اسلام کو مٹانے کے درپے ہو جائے تو کفر کی اس یلغار کو روکنے کے لیے جہاد و قتال کا راستہ اختیار کیا جائے گا اور جہاد و قتال کا یہ عمل اس وقت تک جاری رہے گا جب تک پوری دنیا میں اسلام کا غلبہ نہ ہو جائے۔ چنانچہ رسول اللہ ﷺ کے اس مشن کو جاری رکھنا اُمت پر لازم قرار پایا‘ کیونکہ بقول اقبال ؎

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

مگر افسوس کہ امت خرافات میں کھو گئی۔ بااثر‘ خوشحال افراد اور مسلم حکمران عیش و عشرت میں پڑ گئے۔ دنیا کی زندگی کے ساتھ دل لگا بیٹھے۔ کفر کی پیش قدمی کا نوٹس نہ لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کفر بڑھتا گیا اور مسلمان کافروں کے زیرتسلّط آ گئے۔ اپنی تہذیب کو بھول بیٹھے اور انہیں اپنے آقاؤں کے طور طریقے پسند آنے لگے۔ یہاں تک کہ کافروں کی بے حیائی‘ عریانی اور بے پردگی کو عملاً اختیار کر کے خود ہی اسلامی تعلیمات سے دور ہو گئے۔ یہ نتیجہ ہے جہاد کو چھوڑنے کا!

آج ضرورت ہے کہ مسلمانوں کے اندر جذبۂ جہاد کو ابھارا جائے اور اس راستے میں جان و مال لگانے کو سعادت سمجھا جائے۔ جیسا کہ قرآن مجید میں فرمایا گیا ہے کہ فی سبیل اللہ جان دینے والوں کو مُردہ نہ کہو‘ یعنی وہ عام مرنے والوں کی طرح نہیں ہیں بلکہ وہ نجات یافتہ‘

اللہ کے پیارے اور محبوب ہیں:

﴿وَلَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ يُّقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتٌ ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَشْعُرُوْنَ﴾ (البقرۃ)

''اور جو لوگ فی سبیل اللہ قتل ہو جائیں انہیں مُردہ نہ کہو' بلکہ وہ زندہ ہیں' مگر تم لوگوں کو اس کا شعور نہیں۔''

یعنی شہادت کی موت مرنے والوں کو صرف زندگی نہیں بلکہ حیاتِ جاودانی ملتی ہے۔ اور وہ حیات اتنی ارفع اور اعلیٰ ہے کہ دنیا کے زندہ لوگ اس کا تصور بھی نہیں کر سکتے۔ مزید دیکھئے قرآن مجید میں مقتول فی سبیل اللہ کی فضیلت ان الفاظ میں آئی ہے:

﴿وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ؕ بَلْ اَحْيَآءٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ﴾ (آل عمران)

''اور تم ان لوگوں کو جو فی سبیل اللہ جان دے دیں مُردے خیال نہ کرو' بلکہ وہ اپنے پروردگار کے ہاں زندہ ہیں اور ان کو رزق دیا جاتا ہے۔''

جس طرح شہداء کی زندگی کی کیفیت کا تصور نہیں کیا جا سکتا اسی طرح جو رزق ان کو دیا جاتا ہے وہ بھی انسانی وہم و گمان سے بالاتر ہے۔ گویا شہداء کی زندگی انتہائی حسین و جمیل اور راحت و آرام کی ہے۔ پھر یہ زندگی ابدی ہے' یعنی ماہ و سال کی حدود سے بالاتر ہے۔ زندگی کا یہ سکھ اور چین ایسا ہے کہ کبھی ختم نہ ہوگا اور نہ ہی شہداء کو یہ غم لاحق ہوگا کہ فلاں وقت ان کو ملنے والی یہ اعلیٰ و ارفع نعمتیں ان سے چھن جائیں گی۔

شہداء کے اس انجام پر دل کی گہرائیوں سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یقین تھا' اسی لیے وہ دیوانہ وار غزوات میں شریک ہوتے تھے اور معرکہ حق و باطل میں جان دینے کو اپنے لیے سعادت سمجھتے تھے۔ مرتے وقت ان کے الفاظ یہ ہوتے تھے: فُزْتُ بِرَبِّ الْكَعْبَةِ (ربِّ کعبہ کی قسم' میں کامیاب ہو گیا!)۔ جنگ بدر کے موقعہ پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجاہدین کو قتال کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا: ''ایسی جنت میں جانے کے لیے کھڑے ہو جاؤ جس کی چوڑائی آسمان اور زمین کے برابر ہے''۔ حضرت عمیر بن حمامؓ نے دہرا کر پوچھا تو بھی آپؐ نے وہی جواب دیا۔ عمیر کھجوریں کھا رہے تھے۔ یہ سن کر باقی کھجوریں پھینک دیں' تلوار کی میان توڑ ڈالی اور میدانِ کارزار میں کود گئے اور دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہید ہو گئے۔ (مسلم' کتاب الامارۃ)

یہ یقین ان کے اندر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیدا کیا تھا جو خود اپنے لیے بھی شہادت کی تمنا کرتے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کے یہ الفاظ تھے: ((اَللّٰهُمَّ اِنِّيْ اَسْئَلُكَ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ)) ''اے اللہ میں تیری راہ میں شہادت کا طلبگار ہوں۔'' نیز آپ صلی اللہ علیہ وسلم یہ بھی دعا کرتے تھے: ((اَللّٰهُمَّ ارْزُقْنِيْ شَهَادَةً فِيْ سَبِيْلِكَ))۔ ان الفاظ کے ساتھ آپؐ اللہ کی راہ میں شہادت کی تمنا کرتے تھے۔ آپؐ نے اتنے غزوات میں حصہ لیا لیکن آپؐ کو شہادت کی موت نصیب نہ ہوئی۔ وجہ صاف ظاہر ہے کہ شہادت کا درجہ تو اُمت کے ہر فرد کے لیے کھلا ہے' مگر آپؐ تو اللہ کے رسول' برگزیدہ بندے تھے۔ اس لیے شہادت کی تمنا تو آپ شہادت کی فضیلت کے اظہار کے لیے کرتے تھے ورنہ آپ کا مقام تو شہید فی سبیل اللہ سے کہیں بلند تھا۔ اس کے علاوہ قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿كَتَبَ اللّٰهُ لَاَغْلِبَنَّ اَنَا وَرُسُلِيْ ؕ﴾ (المجادلۃ:۲۱)

''اللہ تعالیٰ نے طے کر دیا ہے کہ میں اور میرے رسول غالب رہیں گے۔''

لہٰذا نہ تو اللہ تعالیٰ پر کوئی غالب آ سکتا ہے اور نہ اس کے رسولوں پر کسی کو غلبہ نصیب ہو سکتا ہے۔ اللہ تو خود القوی ہے اور بے حد غالب ہے۔ نبی اور رسول کا ایک فرق یہ بھی ہے کہ نبی تو باطل پرستوں کے ہاتھوں قتل بھی ہوئے مگر رسولوں کو قتل نہیں کیا جا سکا۔

شہادت فی سبیل اللہ کی فضیلت کو واضح کرتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تمنا بخاری شریف اور مسلم شریف میں موجود ہے:

((لَوَدِدْتُ اَنِّيْ اُقْتَلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ ثُمَّ اُحْيَا ثُمَّ اُقْتَلُ))

''میرے دل میں بڑی آرزو اور بڑی تمنا ہے کہ میں اللہ کی راہ میں قتل کر دیا جاؤں' پھر مجھے زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جائے' پھر قتل کیا جاؤں' پھر زندہ کیا جاؤں اور پھر قتل کیا جاؤں۔''

یہ فی سبیل اللہ قتل ہونے کی لذت کا بیان ہے۔ موت تو ہر ایک کو آنی ہے یہ ایسی حقیقت ہے کہ جس سے انکار ممکن نہیں۔ بالفاظِ قرآنی:

﴿كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ﴾ (آل عمران:۱۸۵)

''ہر جاندار کو موت کا ذائقہ چکھنا ہے۔''

ہم ہر روز لوگوں کو موت کے منہ میں جاتے دیکھتے ہیں۔ کوئی بیماری سے مرتا ہے' کوئی حادثے کا

شکار ہو جاتا ہے۔ جب مرنا ہی ہے تو کیوں نہ اچھی موت کی تمنا کی جائے' جو نہ صرف انجام کے اعتبار سے اچھی ہے بلکہ سہل بھی ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''راہِ خدا میں شہید ہونے والا قتل کیے جانے کی بس اتنی ہی تکلیف محسوس کرتا ہے جتنی تکلیف تم میں سے کوئی آدمی چیونٹی کے کاٹ لینے کی محسوس کرتا ہے۔'' (جامع ترمذی' سنن نسائی' سنن دارمی)

شہادت کی موت کی اس آسانی پر پختہ یقین رکھنا ضروری ہے' کیونکہ یہ خبر محبوبِ خدا رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی ہے جن سے زیادہ سچا کوئی ہوا ہے نہ ہوگا۔ اس بات کی تصدیق اس سے بھی ہوتی ہے کہ جنت میں جانے والا کوئی شخص واپس دنیا میں جانے کی تمنا نہ کرے گا سوائے شہید فی سبیل اللہ کے۔ وہ تمنا کرے گا کہ میں بار بار زندہ ہو کر دنیا میں جاؤں اور اللہ کی راہ میں شہادت کی لذت پاؤں۔ گویا شہادت کی لذت حصولِ جنت سے بھی بڑھ کر ہے۔ رسول اللہ ﷺ فرماتے ہیں جنت میں پہنچ جانے کے بعد کوئی شخص بھی نہیں چاہے گا اور نہیں پسند کرے گا کہ اس کو پھر دنیا میں اس حال میں واپس کر دیا جائے کہ دنیا کی ساری چیزیں اس کی ہوں (وہ سب کا مالک ہو) البتہ جو راہِ خدا میں شہید ہو کر جنت میں پہنچے گا وہ اس کی آرزو کرے گا کہ اس کو پھر دنیا میں واپس بھیج دیا جائے اور وہ پھر (ایک دفعہ نہیں) دس دفعہ فی سبیل اللہ شہید کیا جائے۔ وہ یہ آرزو اس لیے کرے گا کہ جنت میں دیکھے گا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے شہیدوں کا کیسا انعام و اکرام ہے۔ (بخاری و مسلم)

اللہ کی راہ میں شہید ہونے والے اللہ کے محبوب بندے بن جاتے ہیں۔ سورۃ الصّف میں ارشاد ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝۴﴾

''بے شک اللہ تعالیٰ محبوب رکھتا ہے ان لوگوں کو جو اس کی راہ میں (اس کے دین کو بلند کرنے کی خاطر) صف بنا کر قتال کرتے ہیں گویا کہ وہ سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہیں۔''

ظاہر ہے جس نے جان جیسی متاعِ عزیز بھی اللہ کی خاطر قربان کر دی اس نے اپنے پاس کیا رکھا تو ایسا شخص مالک دو جہاں کے ہاں اعلیٰ درجے کا اکرام و اعزاز پائے گا۔ کیونکہ فی سبیل اللہ لڑتے ہوئے خون میں لتھڑا ہوا وجود بڑی قدر والا ہے۔ بقول اقبال ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے ترا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں!

جہاد و قتال کی ترغیب قرآن مجید کی بہت سی آیات اور احادیث مبارکہ میں آئی ہے۔ یہ بہت فضیلت کی بات ہے۔ چنانچہ ہر مسلمان کی خواہش ہونی چاہیے کہ وہ دین اسلام کے غلبے کی خاطر اپنا مال اور جان لگانے کا موقعہ پائے۔ اور کسی مسلمان کو جہاد و قتال سے گریز ہے تو اس کو منافقت کی نشانی بتایا گیا ہے۔ رسول اللہ ﷺ کا فرمان ہے جس شخص نے اس حال میں انتقال کیا کہ نہ تو کبھی جہاد میں عملی حصہ لیا اور نہ کبھی جہاد کا سوچا (نہ اس کی نیت کی) تو اس نے ایک قسم کی منافقت کی حالت میں انتقال کیا۔ (صحیح مسلم)

ہمارا ملک پاکستان اسلام کے نام پر معرضِ وجود میں آیا' لیکن آج بھی یہاں اسلامی قانون نافذ نہیں ہے۔ البتہ نام کے ساتھ اسلامی لکھا جاتا ہے اور آئین کے اندر بھی درج ہے کہ قانون سازی قرآن و سنت کے دائرے میں ہوگی۔ مگر یہ صرف لکھنے کی حد تک ہے۔ ورنہ جو کچھ یہاں ہو رہا ہے وہ خلافِ شریعت ہے' حتیٰ کہ ہمارے عائلی قوانین اسلامی نہیں ہیں۔ عدالتوں میں فیصلے شریعت کے مطابق نہیں' بلکہ انگریزی قانون کے مطابق ہو رہے ہیں۔ نہ ہمارا سیاسی نظام اسلامی ہے' نہ معاشی نظام اور نہ کوئی اور نظام۔ گویا ہم پاکستانی مسلمان غیر اسلامی ماحول میں سانس لے رہے ہیں۔ ہمارے اوپر لازم ہے کہ ہم غلبۂ اسلام کے لیے مخلص ہوں اور اپنے ملک پاکستان میں نظامِ خلافت اسلامی کے لیے جدّوجہد کریں۔ ہمارے ایمان کی سلامتی کے لیے یہ ناگزیر ہے۔ اس کے لیے انفرادی کوشش بھی ضروری ہیں اور اجتماعی بھی۔ چنانچہ ہمارے لیے کسی ایسی جماعت یا تنظیم میں شامل ہونا ضروری ہے جس کا مشن نفاذ اسلام کی منزل کا حصول ہو' اقتدار میں آنا مقصد نہ ہو۔ گویا کسی بھی سطح پر اس جدوجہد میں خود غرضی یا لالچ نہ در آئے' کیونکہ ؎

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت' نہ کشور کشائی!

اگر اس جدوجہد میں کامیابی نظر نہیں آتی تو یہ مایوس ہونے کی کوئی بات نہیں۔ کیونکہ رسول اللہ ﷺ کے فرمان کے مطابق ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب روئے زمین کا کوئی گھر ایسا نہ ہوگا جہاں اسلام نہ داخل ہو۔ لہٰذا ہمارا کام اس مشن میں جدّوجہد کرنا ہے' کامیابی اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

❁❁❁

کلامِ اقبال- قرآن کے ترازو میں

پروفیسر عبداللہ شاہین ☆

ایک روایتی شاعر کا جو نقشہ قرآن کریم نے ''سورۃ الشعراء'' کے آخر میں کھینچا ہے' اُس سے زیادہ صحیح اور واضح تصویر اور کوئی نہیں ہوسکتی۔ شعراء اور ان کی شاعری کا فحوائے عبارت قرآنی یوں تعارف کرایا گیا ہے:

﴿هَلْ اُنَبِّئُكُمْ عَلٰى مَنْ تَنَزَّلُ الشَّيٰطِيْنُ ﴿٢٢١﴾﴾

''لوگو! کیا میں تمہیں بتاؤں کہ شیاطین کا نزول کس پر ہوتا ہے؟''

﴿..... عَلٰى كُلِّ اَفَّاكٍ اَثِيْمٍ ﴿٢٢٢﴾﴾

''..... ہر بول بچنے لپاٹیئے پر''

﴿وَالشُّعَرَآءُ يَتَّبِعُهُمُ الْغَاوٗنَ ﴿٢٢٤﴾﴾

''اور شعراء کی پیروی تو راہ گم کردہ بہکے ہوئے لوگ ہی کیا کرتے ہیں۔''

یعنی محض سڑکیں ناپنے والے (road master) آوارگان ہی ایسے بے منزل' خوش گپی شعراء لوگوں کے پیچھے لگا کرتے ہیں۔

﴿..... اَنَّهُمْ فِيْ كُلِّ وَادٍ يَّهِيْمُوْنَ ﴿٢٢٥﴾﴾

''شاعر لوگ زندگی کی ہر وادی میں بغیر کسی خاص مقصد کے منہ مارتے پھرتے ہیں۔''

﴿وَاَنَّهُمْ يَقُوْلُوْنَ مَا لَا يَفْعَلُوْنَ ﴿٢٢٦﴾﴾

''اور کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں۔''

گویا ان کے قول و فعل اور فکر و عمل میں زبردست خلا (gap) اور ایک بڑی خلیج واقع ہوتی ہے۔ اب جو لوگ انہیں رہنما سمجھ کر ان کی پیروی کرنے لگیں وہ گمراہ ہو جاتے ہیں' کیونکہ آوارہ گرد کی خود اپنی کوئی منزل نہیں ہوتی۔ اس لیے وہ دوسروں کو کسی منزلِ مقصود تک کیسے پہنچائے گا؟

☆ ریٹائرڈ پرنسپل' گورنمنٹ کالج حافظ آباد

آج وہ اپنی موج میں ایک راستے کا پتا دے رہا ہے تو کل ایک نئی ترنگ میں کسی دوسری راہ پر چل پڑے گا۔ اور بمصداقِ حدیث نوبت یہاں تک بھی آ سکتی ہے کہ: ((قَائِدُوْهُمْ اِلَى النَّارِ)) شاعر اپنے متبعین کو جہنم کی راہ بھی دکھا سکتا ہے۔ چنانچہ یہ مسلّمہ حقیقت ہے کہ ''محض شاعر'' ایک اچھا رہنما اور پیشوا نہیں بن سکتا۔ اس کا کوئی مخصوص نظریۂ حیات اور مقصودِ زندگی نہیں ہوتا' بلکہ وہ زندگی کی تمام وادیوں میں صحرانوردی و کوچہ گردی کرتا ہے اور جس منظر سے ہنگامی طور پر متاثر ہوتا ہے اس کو ردیف و قافیہ کے سانچے میں ڈھال دیتا ہے۔ اس کے جذبات اور تاثرات کی لہریں کسی آئین کی پابند نہیں ہوتیں۔ وہ کسی خاص ضابطۂ حیات کا مبلّغ نہیں ہوتا۔ اس کا تاثر ہنگامی ہوتا ہے جو مستقل ارادہ و عمل میں نہیں ڈھلتا۔ ایسا شخص جس کے مزاج میں تلون اور گونا گوئی ہو اگر اسے رہنما سمجھ لیا جائے تو یقیناً گمراہی ہی پلّے پڑے گی۔ پس قرآن مجید نے یہ عمومی قاعدہ کلیہ بیان کیا ہے کہ شعراء عموماً بے عمل لوگ ہوں گے۔ صرف ایک ذہنی لذّت کے حامل' اور سوائے ذہنی عیاشی کے بالعموم کوئی اور شے ان لوگوں کی زندگیوں میں نظر نہیں آئے گی۔ ان کا حال یہ ہے کہ کہیں عشق بازی اور شراب نوشی کے مضامین بیان ہو رہے ہیں اور ان کے ہم جلیس و ہم نشین اچھل اچھل کر ان کو داد دے رہے ہیں۔ کہیں کسی زنِ بازاری بلکہ کسی گھر کی بہو بیٹی کا حسن موضوعِ سخن ہے اور حاضرین و سامعین مزے لے رہے ہیں۔ کہیں جنسی محاکات کی صنعت گری ہے اور پورے مجمع پر شہوانیت کا بھوت سوار ہے۔ کہیں ہزل گوئی اور ہرزہ سرائی جاری ہے' کہیں لطیفہ بازی اور مسخرہ پن کی باتیں ہو رہی ہیں اور ہر طرف ٹھٹھے لگ رہے ہیں۔ کسی کی ہجو ہو رہی ہے اور لوگ محظوظ ہو رہے ہیں' کسی کی بے جا تعریف میں تحسین و آفرین کے ڈونگرے برسائے جا رہے ہیں۔ گویا عمومی شعراء کا تو سن فکر ایک بے لگام گھوڑے کی طرح ہر وادی میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ جذبات و خواہشات کی ہر نئی رَو اُن کی زبان سے ایک نیا اور متضاد مضمون ادا کراتی ہے۔ یعنی ؎

دل میں اک لہر سی اٹھی ہے ابھی
کوئی تازہ ہوا چلی ہے ابھی

والا معاملہ ہے۔ کبھی حکمت و موعظت کی باتیں ہونے لگتی ہیں اور کبھی انتہائی سفلی جذبات کا ترشح ہونے لگتا ہے۔ کسی سے خوش ہوئے یا وظیفہ و انعام کی حرص ہوئی تو اسے آسمان پر چڑھا دیا اور کسی سے نالاں ہوئے تو اسے تحت الثریٰ میں جا گرایا۔ ایک بخیل کو حاتم اور ایک بزدل کو رستم

وسہراب بنا دیا۔ بالفاظِ دیگر خدا پرستی و دہریت‘ مادہ پرستی اور روحانیت‘ حسنِ اخلاق اور بدخلقی‘ پاکیزگی اور رذالت‘ سنجیدگی اور ہزل‘ قصیدہ اور ہجو سب کچھ روایتی شاعر کے کلام میں پہلو بہ پہلو مل جائے گا۔ شاعری کے مزاج میں فی نفسہٖ یہی خرابی ہے اور اس کی منطقی وجہ یہ ہے کہ شعر و شاعری کا تعلق ہے شعور و تخیل سے‘ انسان کے تصورات سے‘ اور تخیّل و تصوّر کی دنیا حدود و قیود کی پابند نہیں ہوتی۔ انسانی تصور اور خیال کہیں سے کہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے کہ شعور پرواز کرتا ہے۔ ابھی فرش پہ تھا‘ ابھی آکاش کی بلندیوں پر پہنچ گیا۔ نتیجتاً ’’یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ‘‘ کی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے‘ یعنی جو کچھ کہتے ہیں وہ کرتے نہیں یا کر نہیں پاتے‘ کیونکہ عمل کی زندگی میں آدمی کو قدم قدم پھونک پھونک کر چلنا پڑتا ہے۔ تخیل میں جو بلند پروازی ہے‘ انتہائی مشکل ہے کہ زمین کے اوپر بھی اسی درجے کی چال ڈھال ہو۔ جو فکر کی جولانی ہے‘ زمینی حقائق (ground realities) اور سیرت بھی اسی کے مطابق ہو۔ البتہ یہ ناممکنات میں سے نہیں ہے‘ استثناء ہے۔ اور یہ ہے بر بنائے‘ عبارت قرآنی: ﴿اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ .....﴾ کہ شاعری کے میدان میں قدم بھی ہو اور مذکورہ بالا رذائل سے بچنا بھی‘ یعنی بفرمانِ نبویؐ ((اِنَّ مِنَ الشِّعْرِ لَحِکْمَۃً)) کے فضائل بھی حاصل کرنا چاہتا ہو تو اس کے لیے شدید مشقت کرنی پڑے گی۔ یعنی ایمانِ راسخ اور اس کے ساتھ مسلسل عمل صالح اور اللہ کی یاد کثرت کے ساتھ ﴿وَذَکَرُوا اللّٰہَ کَثِیْرًا﴾ تاکہ ﴿وَانْتَصَرُوْا مِنْ بَعْدِ مَا ظُلِمُوْا﴾ میں ہجو یہ و رجزیہ شاعری میں اشعار کا ترازو اعتدال و توازن سے ادھر ادھر نہ ہونے پائے۔ بلاشبہ علامہ محمد اقبال کو یہ استثنائی حیثیت حاصل ہے۔

اسی طرح انسانی معاشرہ میں بسنے والے نفوسِ انسانی میں نفسیات کے اعتبار سے مختلف درجاتِ ذہنی کے حامل انسان موجود ہوتے ہیں۔ فطین بھی‘ ذہین بھی‘ متوسّط الذہن اور کُند ذہن بھی۔ ذکاوت و ذہانت کی اس تقسیم کے بموجب اصطلاحاً ایک طبقہ intelligentsia کہلواتا ہے‘ جو ہر معاشرہ میں ایک قلیل تعداد (minute minority) ہوتی ہے۔ ایسے قلوب و اذہان کی حامل شخصیات ہر معاشرہ میں فیصلہ کُن (decisive) مقام رکھتی ہیں‘ کیونکہ یہ معاشرہ کا رُخ متعیّن کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان میں سے جو افراد پند و موعظت اور دانش و حکمت سے کام لینے والے ہوتے ہیں ان ہی کے بارے میں قرآن مجید نے کہا کہ ﴿مَنْ یُّؤْتَی الْحِکْمَۃَ فَقَدْ اُوْتِیَ خَیْرًا کَثِیْرًا﴾ کیونکہ تعلیم و تربیت میں سب سے اونچا مرحلہ دانائی

اور حکمت کی بات ہے۔ تمام تر مسلّمہ اصولوں کے مطابق یہ سمجھنا کہ کس شے کی اہمیّت زیادہ ہے اور کس کی کم! کیا اوّلین ہے اور کیا ثانوی؟ یہ لوگ اصولوں کو جاننے والے اور اصولوں کو متعیّن کرنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی دعوت دلائل و براہین پر مبنی ہوتی ہے اور قرآن کی دعوت بھی ﴿فَاْتُوْا بُرْھَانَکُمْ﴾ ’’لاؤ دلیل‘‘ ہی ہے۔ اس نابغہ روزگار طبقہ (intelligentsia) کے ’’سرخیل‘‘ علامہ محمد اقبال ہیں‘ جو نہ صرف حکیم ہیں بلکہ حکیم الامت ہیں۔ جن کا اپنا ہی شعر صدفی صد خود ان ہی پر راست اور صادق آتا (جو اگرچہ انہوں نے مرزا غالب کے بارے میں کہا تھا) کہ ؎

فکرِ انساں پر تری ہستی سے یہ روشن ہوا
ہے پر مرغِ تخیل کی رسائی تا کجا!

جن کا علمی و فنی شعور انتہائی بلند ہے۔ اس کے باوجود وہ کسی پر اپنے علم کا رعب نہیں ڈالنا چاہتے بلکہ ان کے کلام کو ’’از دل خیزد بر دل ریزد‘‘ کا مقام حاصل ہے‘ یعنی ؎

دل سے جو بات نکلتی ہے اثر رکھتی ہے
پر نہیں‘ طاقت پرواز مگر رکھتی ہے
قدسی الاصل ہے‘ رفعت پہ نظر رکھتی ہے
خاک سے اٹھتی ہے‘ گردوں پہ گزر رکھتی ہے

بایں ہمہ خصائل و فضائل ان کے کلام کو یہ مقام و مرتبہ حاصل نہیں ہے (جو میرؔ نے اپنے بارے میں انتہائی غلو سے کام لیتے ہوئے قطعاً بے جا کہا تھا) ؎

سارے عالم پر ہوں میں چھایا ہوا
’’مستند‘‘ ہے میرا فرمایا ہوا!

یہ مقام و مرتبہ تو حقیقتاً اللہ تعالیٰ اور اس کے کلام کو حاصل ہے‘ بعد ازاں حدیثِ دلبرِ الٰہی (ﷺ) کو ’’سند‘‘ کا درجہ حاصل ہے‘ کیونکہ وہ ﴿وَمَا یَنْطِقُ عَنِ الْھَوٰی ۝۳ اِنْ ھُوَ اِلَّا وَحْیٌ یُّوْحٰی ۝۴﴾ کی شان والے اور معصومیت کی امان والے ہیں۔ باقی تو کوئی بھی معصوم نہیں ہے‘ یہاں تک کہ ائمہ اور صحابہ رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی یہ گارنٹی حاصل نہیں ہے۔ غیر نبی کوئی بھی ہو‘ خواہ کتنا ہی بڑے سے بڑا ہو‘ اسے نگہبانی باری تعالیٰ کی خلعت مرحمت نہیں ہوئی۔ یہ استثنائی حیثیت صرف اور صرف انبیاء علیہم السلام کو اوّل روز ہی سے عطا ہوتی ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ان کا رشتۂ وحی قائم ہو جاتا ہے۔ بنابریں علامہ محمد اقبال جنہیں ’’شاعرِ مشرق‘ شاعرِ ملتِ اسلامیہ‘ حکیم

الامّت اور محیّ الملّت والدّین'' تک کے القابات سے نوازا گیا ہے' ان کے بارے میں برصغیر میں ان کے انتہائی معتقد و معترف اور کلام اقبال کے سب سے بڑے رسیا اور شیدائی (fan) اور ''یکے از رگہائے سازِ اقبال'' جناب ڈاکٹر اسرار احمد مرحوم و مغفور نے بہت متوازن و معتدل بات کہی ہے' جب ایک خطاب کے دوران آپؒ نے فرمایا:

''میرے نزدیک علامہ محمد اقبال قطعی طور پر' یقینی طور پر' حتمی طور پر فکر اسلامی' خاص طور پر اسلام کے فکر انقلابی کے مجدد ہیں۔ وہ اسلام کی نشاۃِ ثانیہ کے نقیب اعظم ہیں۔ انہوں نے نظریۂ اسلام اور مسلمانوں کے زوال پذیر ہو جانے کے بعد اس نظریہ کو دوبارہ زندہ کیا اور یہ خوشخبری دی کہ اسلام کا دوبارہ غلبہ ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ اقبال نے جس جزم' جس یقین اور جس وثوق کے ساتھ ملّتِ اسلامیہ کے احیاء کی بشارت دی ہے وہ اقبال سے پہلے کسی کے ہاں نہیں ملتی۔

حالی نے بھی ''مدو جزر اسلام'' کے نام سے اپنی مسدس لکھی۔ مگر اسے پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے شش جہت' ہر سو مایوسی کے گھٹا ٹوپ اندھیرے ہی اندھیرے ہیں۔ ہر جگہ جزر کے بعد مد بھی ہوتی ہے لیکن شاید ہمارا صرف جزر ہی جزر ہے' مد کا کوئی سوال ہی نہیں ہے' بقول حالی: ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے!

گویا قانونِ فطرت ہی بدل گیا ہے۔ حالی اور اقبال میں بہت کم فصل ہے۔ لیکن اقبال نے آ کر نوجوان نسل کے دلوں میں امید کے چراغ روشن کر دیے ؎

کبھی اے نوجواں مسلم تدبّر بھی کیا تو نے
وہ کیا گردوں تھا تو جس کا ہے اک ٹوٹا ہوا تارا
نکل کے صحرا سے جس نے روما کی سلطنت کو الٹ دیا تھا
سنا ہے یہ قدسیوں سے میں نے وہ شیر پھر ہوشیار ہوگا
آسماں ہو گا سحر کے نور سے آئینہ پوش
اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

لہٰذا اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ بیسویں صدی عیسوی کے نہ صرف وہ عظیم اسلامی مفکر' بلکہ ملت اسلامیہ کے احیاء کے عَلَم بردار اور مبشّر بھی ہیں۔ اقبال ہی کے بقول ؎

کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا!

چنانچہ انقلاب ایران کے سلسلہ میں بھی یہ تسلیم کیا گیا ہے کہ فلسفہ انقلاب کی تمام تر رہنمائی اقبال کے فکر سے حاصل کی گئی تھی۔ بایں سبب ڈاکٹر علی شریعتی' جنہوں نے ایران میں انقلابی کام کیا ہے' اپنی کتاب ''ما و اقبال'' (اقبال اور ہم) میں صاف طور پر کہتے ہیں کہ ہمارا سارا فلسفۂ انقلاب ''فکرِ اقبال'' سے ماخوذ ہے۔ اسی طرح برصغیر میں ابوالکلام آزاد نے بھی اقبال ہی سے خوشہ چینی کی ہے' جبکہ سید مودودیؒ نے ان سے استفادہ کر کے اسی فکر کو عام فہم بنایا ہے۔ اس سب کے باوجود جو حقیقت ہے اسے تسلیم کیجیے کہ اقبال شعور اور فکر کی انتہائی بلندیوں پر ہونے کے باوجود مردِ میدان (man of action) نہیں تھے۔ ان کی فکر کے مقابل ان کے عمل کا پلہ بہت کم اور ہلکا تھا۔ لہٰذا ہمیں عدل سے کام لینا ہوگا۔ ہر شے کو جہاں وہ ہے وہیں رکھنا اور ماننا پڑے گا۔ پس سیدھی سیدھی بات ہے کہ معروف معنوں میں وہ متدین انسان بھی نہیں تھے۔ عشق رسولؐ جتنا بھی ہو' دل میں محبت رسولؐ جس قدر ہو' مگر اتباعِ رسولؐ' نماز پنجگانہ' اس کی بروقت اور مسجد میں ادائیگی' شعائر دینی کی اہمیت بہرحال مسلم ہے۔ فکر و فلسفہ کے وہ مہادیو (intellectual giant) تھے' مگر جہاں تک عمل کا تعلق ہے ان کا پلڑا خفیف تھا۔ وہ خود کہتے ہیں: ؎

اقبال بڑا اپدیشک ہے من باتوں میں موہ لیتا ہے
گفتار کا یہ غازی تو بنا' کردار کا غازی بن نہ سکا

اور یہ کہ ؎

مسجد تو بنا دی شب بھر میں ایماں کی حرارت والوں نے
مَن اپنا پرانا پاپی ہے' برسوں میں نمازی بن نہ سکا

اس لیے ہمیں حقائق کو ماننا پڑے گا۔ ہمیں اپنے ''معیار'' کو ختم (یا تبدیل) نہیں کرنا ہے اور معیار ہمارے لیے ہے ''محمد رسول اللہ ﷺ'' اور یہ خود اقبال کا کہنا ہے ؎

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نہ رسیدی تمام بولہبی است

''حضرت محمد ﷺ کی حدیث وسنت تک رسائی حاصل کرو کہ دین کی اساس آپؐ ہی ہیں۔ اگر تو ان کی اتباع کو نہیں پہنچتا تو تیرے تمام اعمال' ابولہب کا طرزِ عمل قرار پائیں گے۔''

چنانچہ میں ان کے لیے کبھی ''حضرت'' نہیں لکھتا' ''رحمۃ اللہ علیہ'' نہیں لکھتا بلکہ ہمیشہ ''مرحوم'' کا لفظ لکھتا ہوں۔ اور یہی لفظ اپنے والدگرامی کے لیے بھی لکھتا ہوں۔''

اس تمہید طولانی کے بعد ''تمنا مختصر سی ہے'' کے مصداق صرف یہ عرض کرنا ہے کہ بلاشبہ علامہ محمد اقبال خیال آرائی' مضمون آفرینی اور فکر وفن' ہر اعتبار سے ایک ''استثنائی'' شاعر کی حیثیت کے حامل تھے' جس کا ثبوت ان کے لڑکپن کی شاعری سے ہی مل جاتا ہے' جب آپ کی صریرِ خامہ یوں نوائے سروش بنتی ہے: ؎

موتی سمجھ کے شانِ کریمی نے چُن لیے
قطرے جو تھے مرے عرقِ انفعال کے

ملاحظہ کیجیے کہ آپ کی ابتدائی شاعری کے اس شعر میں تخیل کس قدر بلند' اچھوتا اور پاکیزہ ہے' انتخابِ الفاظ کتنا نادر' عمدہ ادبیت واستحسان سے بھرپور ہے' تراکیب کی بندش کیا خوب اور ''عرقِ انفعال'' کی ''موتیوں'' سے تشبیہہ' علم بیان کا کیسا بہترین' حسن آفریں اور محبت بھرا استعمال ہے!

بتقاضائے بشریت شاعر سے گناہ کا سرزد ہو جانا ایک فطری سا عمل ہے' جسے دوسرے شعراء نے بھی بیان کیا ہے اور اس موضوع پر خامہ فرسائی اور طبع آزمائی بالعموم ہے۔ مثلاً بقول غالب: ؎

نہ ہم سمجھے' نہ آپ آئے کہیں سے
پسینہ پونچھئے' اپنی جبیں سے!

اور بزبانِ پنجابی

اتوں پوہ دا مہینہ
تیرے متھے تے پسینہ
گل کھل گئی اے!

یعنی جب شاعر کا ''رازِ عصیاں'' فاش ہو گیا اور ع ''تاڑنے والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں'' کے مصداق اس کا ''جرم خانہ خراب'' افشاں ہو گیا' تو اس خیال سے کہ ع ''لوگ دیکھیں

نہ تماشا مری رسوائی کا'' مارے شرمندگی کے وہ آب آب ہو گیا۔ جس سے بقول شاعر کے ؎

لاکھ چھپاؤ' چھپ نہ سکے گا راز یہ کتنا گہرا
دل کی بات بتا دیتا ہے اصلی نقلی چہرہ

اُلٹا اس کا guilty minded ہونا عیاں ہو گیا —— مگر اقبال نے اسی فطری لغزشِ انسانی کو کس اپج اور طرفگی سے باندھا ہے کہ گھسا پٹا خیال ہونے کی بجائے اس میں ایک انوکھا' نرالا اور نیا پن آ گیا ہے۔ چنانچہ جب اقبال کو بھی نفس امارہ کی دعوتِ رندانہ کے باعث درِ جاناں اور دورِ زمانہ کی اسی نفسیاتی کیفیت سے گزرنا پڑا ہے تو کیا کہنے اس ''زود پریشاں کے پشیماں'' ہونے کے! —— اس نے عوام الناس کی شرمندگی کے خوف سے اپنی لغزش چھپانے کی بجائے اپنے علیم وخبیر اور حاضر وناظر رب کے سامنے اعترافِ خطا کرتے ہوئے اپنی غلطی کو نوعِ بشر کے جدامجد آدم علیہ السلام اور دیگر انبیاء ورسل کے نقوشِ بندگی کی پیروی میں:

﴿رَبَّنَا ظَلَمْنَا اَنْفُسَنَا .....﴾ اور

﴿لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ سُبْحٰنَكَ اِنِّیْ كُنْتُ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ﴾

کے سانچے میں ڈھال دیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کو تو ''اِنِّیْ تُبْتُ اِلَیْكَ'' یعنی توبہ کرنے والے بندے اتنے محبوب ہیں کہ ''شانِ کریمی'' ندامت کی ہر بوند کو دُرِّ شہوار اور نوادراتِ لعل وگہر بنا دیتی ہے۔ جب عاصی' حنّان ومنّان اور وَدُود رب کے حضور شرمساری وندامت سے شبنمی جبیں اور جبہہ نگیں ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کے آب آب گل بدن اور بھول پنے کے چھینٹوں کو اپنے کرم کے موتیوں کی لڑی میں پرو دیتا ہے۔ اقبالِ جرم کرنے والے کو وہ اقبال مندیاں عطا فرماتا ہے کہ اس کی جبین نیاز کو رحمت باری بوسۂ ناز سے ہم آغوش وبغلگیر (embrace) کر لیتی ہے —— اس طرح شاعر Guilty conscious نہیں رہتا بلکہ سکینت وطمانیت سے سرفراز ہو کر نفسِ مطمئنّہ کی بلندیوں پر فائز ہو جاتا ہے —— یہ تمام کیفیات' تفصیلات اور محاکات اقبال نے اپنے مذکورہ بالا دو مصرعوں میں سمو دی ہیں۔ اس طرح اقلیم شاعری کا ایک جہاں گیر و جہاں دار و جہاں آراء شاعر ہونا ثابت کر دیا ہے۔ ❁❁

میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے انٹرنیٹ ایڈیشن
تنظیم اسلامی کی ویب سائٹ www.tanzeem.org پر ملاحظہ کیجیے۔

ہمارے مسائل کا حل

اور دجّالی نظام کا مقابلہ

محمد رشید عمر

ہمارے حل طلب مسائل کیا ہیں؟ انہیں حل کرنے کا نسخۂ کیمیا کیا ہے؟ ہم کس دجّالی سازش کا شکار ہیں اور اس کا مقابلہ کیسے کیا جا سکتا ہے؟ ان سوالوں کا جواب ہم قرآن وسنّت کی روشنی میں' بالخصوص سورۃ المائدۃ کے مضامین کی روشنی میں' سمجھنے کی کوشش کریں گے۔

سورۃ المائدۃ میں اُمّتِ مسلمہ کے لیے تکمیلِ شریعت کی بشارت کے ساتھ کچھ اہم احکامِ شریعت بیان کیے گئے ہیں۔ ساتھ میں بنی اسرائیل کے زوال کے اسباب —— جیسے ہدایتِ خداوندی کے تقاضوں کو بھول جانا' بدعہدی' خیانت اور غداری کا ارتکاب' حرام خوری اور جھوٹ کا شکار ہو جانا' باہم خون ریزی کی آگ بھڑکانا' گمراہ قوموں کی نقالی اور پیروی' اللہ کی طرف سے مہلت اور ڈھیل کو سرکشی اور بغاوت کے لیے استعمال کرنا' امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے فریضہ سے پہلوتہی' فسق وفجور کے باوجود اپنے آپ کو اللہ کا چہیتا اور جنّت کا مستحق سمجھنا' اور گمراہی کی انتہا یعنی مسیح علیہ السلام کو اللہ کا بیٹا قرار دینا اور ان کی والدہ کو بھی الوہیت میں شریک کرنا —— کا ذکر کیا گیا ہے۔ لیکن اس پستی سے نکلنے کا نسخۂ کیمیا بھی بتایا گیا ہے۔ اس طرح اُمّتِ مسلمہ کے سامنے ایک آئینہ رکھ دیا گیا ہے کہ ایسے حالات میں سے کیسے نکلا جا سکتا ہے۔ اس مضمون میں ہم نے متذکرہ آیات کی روشنی میں اپنے متعلقہ پہلوؤں پر بات کی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَلَوْ اَنَّ اَهْلَ الْكِتٰبِ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّاٰتِهِمْ وَلَاَدْخَلْنٰهُمْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ ﴿٦٥﴾﴾ (المائدۃ)

''اور اگر اہلِ کتاب ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان سے ان کی برائیاں دور کر دیتے اور انہیں نعمت بھری جنتوں میں داخل کر دیتے۔''

وہ برائیاں کیا ہیں جن کا انسان شکار ہو جاتا ہے اور اپنی منزل کھوٹی کر بیٹھتا ہے؟ یہ برے اعمال کے نتائج ہیں جن سے معاشرہ بڑے مسائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ اس کی مثال اُلجھی ہوئی ڈور کی سی ہو جاتی ہے جس کا سرا ہاتھ نہیں آتا۔ ایسے مسائل میں سے چند ایک کا ذکر کیا جاتا ہے:

(۱) قحط الرّجال اور قیادت کا فقدان: ایسی قیادت میسر نہیں آتی جو صحیح راہنمائی کر سکے اور حالات کو سمجھ کر اپنی قوم اور ملت کو اقوامِ عالم میں باعزت مقام دلا سکے' مخالفین کا مقابلہ کر سکے اور ان کی چالوں کو سمجھ کر پیش بینی کر کے منصوبہ بندی کر سکے۔ قرآن حکیم کے الفاظ میں صورتحال یہ ہو جاتی ہے:

﴿وَلَا تَكُوْنُوْا كَالَّذِيْنَ نَسُوا اللّٰهَ فَاَنْسٰهُمْ اَنْفُسَهُمْ ۭ﴾ (الحشر:۱۹)

''ان لوگوں جیسے نہ ہو جاؤ جنہوں نے اللہ کو بھلا دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنا آپ بھلا دیا۔''

(۲) معیشت کا زوال: باوجود وسائل کی فراوانی کے معاشرہ ان سے استفادہ کی صلاحیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ انفرادی حرص ولالچ اور ہوس پرستی اس طرح مسلط ہو جاتی ہے کہ ہر طرف لوٹ کھسوٹ کا بازار گرم ہو جاتا ہے۔ تجوریاں بھرنے سے سیری حاصل نہیں ہوتی۔ ان کے استعمال میں نمود ونمائش کی انتہا ہو جاتی ہے۔ ہوس وشہوت کسی حد اور قید کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہوتی۔ حلال وحرام کی کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ اس کی اعلیٰ ترین تصویر کشی فرمانِ رسول اللہ ﷺ میں کی گئی ہے' مفہوم عرض ہے:

''بنی آدم کا پیٹ کسی چیز سے نہیں بھرتا —— سونے سے بھری ایک وادی اس کو دے دی جائے تو دوسری کی تمنّا کرے گا —— اس کے پیٹ کو قبر کی مٹی ہی بھر سکتی ہے۔''

دوسری طرف محروم طبقات پس کے رہ جاتے ہیں۔ انہیں دو وقت کی روٹی میسّر نہیں ہوتی۔ خودسوزیاں اور خودکشیاں شروع ہو جاتی ہیں۔ مال ودولت سے مدہوش طبقات پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ذرا جائزہ لیجیے اپنے ملک عزیز کا کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں کس کس نعمت سے نہیں نوازا۔ میدان' پہاڑ' دریا' سمندر' سب کچھ دیا ہے۔ ہر قسم کی فصلیں اور پھل پیدا کرنے والے اعلیٰ نہری نظام سے سیراب ہونے والے میدان' معدنیات کے ذخائر لیے ہوئے پہاڑ اور علاقے' گیس اور پٹرول کے ذخائر' بجلی پیدا کرنے کے وسائل' آبِ حیات سے بھرپور سمندر' سب کچھ اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے' جو مسلسل لوٹ کھسوٹ کے باوجود ختم ہونے کو نہیں آ رہا۔ لیکن اس کے باوجود ملّتِ اسلامیہ پاکستان کا ہر فرد ہزاروں ڈالر کا مقروض اور بنیادی ضروریاتِ زندگی جیسے تعلیم'

علاج اور پینے کے پانی سے محروم ہے۔ گلی محلے اور بستیوں سے گزرنا مشکل ہے۔ انڈسٹری بجلی اور گیس کی لوڈشیڈنگ سے تباہ حال ہے۔ بے انتہا وسائل کے باوجود انڈسٹری کا پہیہ کیوں نہیں چل رہا؟ اور گلیاں محلے کیوں گندگی سے اَٹے اور اندھیروں میں ڈوبے رہتے ہیں؟

(۳) جدید ٹیکنالوجی میں پسماندگی: ملک عزیز کی آبادی ۱۸ کروڑ کے قریب ہے۔ ان اٹھارہ کروڑ دماغوں میں کیا بھس بھرا ہوا ہے؟ سائنسی ایجادات میں ہمارا حصہ کتنا ہے؟ محنت سے جی چرانا اور غیروں کی نقالی کو کیوں ہم نے اپنا وطیرہ بنا لیا ہے؟ یہاں میں جدید ذرائع ابلاغ کی مثال دوں گا' جس میں کمپیوٹر اور موبائل فون بہت عام ہے۔ اس میں دنیا کس طرح مال کما رہی ہے؟ ذرا غور کیجیے' ایک کمتر موبائل دو اڑھائی ہزار روپے کا ملتا ہے۔ اس کا وزن ۱۰۰ یا ۱۵۰ گرام ہوگا' یعنی دھات اور پلاسٹک کا مجموعہ جس کے پرزوں کو الگ الگ کر دیا جائے تو کوڑے میں پھینکنے کے علاوہ کوئی مصرف نہ رہے۔ لیکن بنانے والے ممالک ہم سے اس کی بہت زیادہ قیمت لے رہے ہیں اور ہم اپنا بے شمار سرمایہ ان پر لٹا رہے ہیں۔ اس کے مقابلے میں ذرا غور کیجیے' اپنے ملک کی پیدا کردہ ایک کلوگرام کپاس سے ہم کتنی قیمت کما رہے ہیں؟ کپاس' جس کی کوئی شکل بھی کوڑے میں نہیں پھینکی جا سکتی' اس قدر قابل استعمال شے' لیکن ہم اس سے کتنا زرمبادلہ کما رہے ہیں؟ باوجود اس کے کہ دُنیا کے بہت بڑے حصے میں یہ پیدا ہی نہیں ہوتی۔ سونے پر سہاگہ یہ کہ اس سے پراڈکٹ بنانے کی مشینری بھی ہم ان ملکوں سے منگواتے ہیں جہاں یہ سرے سے ہوتی ہی نہیں ہے۔ ایسا کیوں ہے؟ کیا یہ کام کرنے کے لیے ہمارے لوگوں کے پاس دماغ نہیں ہے؟ نہیں! بلکہ صورت واقعہ یہ ہے کہ ملک عزیز کا ماحول اور حالات ایسے ذہین دماغوں کی قدر نہیں کر رہا جس کی وجہ سے باوجود جذبہ حُبّ الوطنی کے پاکستان کا اتنا قیمتی سرمایہ بیرون ملک منتقل ہو جاتا ہے۔

یہ سب ہماری بداعمالیوں کے چند نتائج کی ایک جھلک ہے' ورنہ ان میں کئی اور کا بھی اضافہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کا حل درج بالا آیت میں یہ فرمایا گیا ہے کہ اگر تم ایمان اور تقویٰ اختیار کرو گے تو ہم ان بداعمالیوں کا کفارہ اپنی طرف سے ادا کر کے حالات کو بدل دیں گے۔ اللہ ہی کی قدرت میں انسانی دل و دماغ ہیں کہ وہ ایک لمحہ میں اس کی اصلاح کر کے اعلیٰ قائدانہ' دانش مندانہ اور ایجادانہ صلاحیتوں سے نواز سکتا ہے۔ زمین و آسمان کے سارے خزانے اس کے ہاتھ میں ہیں اور وہ ہمیں ان سے بہترین استفادہ کی صلاحیتوں سے بھی نواز سکتا ہے۔

(۴) عدل و انصاف کا فُقدان: چوتھا بڑا مسئلہ عدل و انصاف کا فقدان ہے۔ عورت اور مرد

کے حقوق و فرائض کے درمیان عدل کی حدود عدل کی حدود ٹوٹ چکی ہیں اور یہ معاملہ باہم دگر مخلوط ہو چکا ہے' الا ماشاء اللہ۔ مخلوط ادارے' چاہے تعلیم کے ہوں' انتظامی معاملات یا صحت کے' ان سب میں اختلاطِ مرد و زن نے سب کو ہیجانِ نفسی کا شکار کر رکھا ہے۔ انسانوں کے مابین معاشرتی و طبقاتی تقسیم نے دوریاں پیدا کی ہوئی ہیں۔ وی آئی پی کلچر نفرتوں اور حسد کا سبب بن گیا ہے۔

سرمائے کے مقابلے میں محنت کی کوئی عزت باقی نہیں رہی۔ ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ نوجوان اَن پڑھ سرمایہ دار کے پاس اس کی شرائط پر کام کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے' حالانکہ ایک فلاحی نظام بنیادی ضرورتوں کا ضامن ہوتا ہے اور جب تک کسی کام کرنے والے کو اس کے معیار کے مطابق محنت کا معاوضہ نہ ملے اس وقت تک اجتماعی نظام اس بات کا ضامن ہے کہ وہ اس کی کفالت کا بندوبست کرے' اور محنت کی قدر و قیمت اُجاگر کرنے کے ساتھ ساتھ بھیک مانگنے اور ہڈحرامی کی حوصلہ شکنی بھی کرے۔

حکمرانوں اور رعایا کے درمیان عدل کا مطلب ان کے درمیان دوریوں کا خاتمہ ہے۔ حکمران طبقہ کو خصوصی رعایتیں نہ ہوں' انہیں استثناءات حاصل نہ ہوں اور جتنی بڑی ذمہ داری ہو اتنا ہی وہ اپنے آپ کو ذمہ دار سمجھے۔ عدالتوں میں انصاف فراہم ہو' خریدنا نہ پڑے۔ لیکن ذرا غور کیجیے کہ جس نظام میں فحاشی اور بے حیائی کو لائسنس دیا جائے' جس دستور میں سود پر کوئی پابندی نہ ہو اور حکمران طبقہ کو استثناءات سے نوازا گیا ہو' وہ آئین اور دستور عدل فراہم کر سکتا ہے؟ کوئی اعلیٰ سے اعلیٰ جج انصاف فراہم نہیں کر سکتا اور کوئی بڑی سے بڑی عدالت عدل فراہم نہیں کر سکتی جب تک کہ قانون میں عدل فراہم کرنے کی صلاحیت نہ ہو' اور یہ مسلمہ حقیقت ہے کہ انسانوں کا بنایا ہوا کوئی قانون عدل فراہم نہیں کر سکتا۔ صرف اور صرف خالق کائنات کا دیا ہوا قانون ہی عدل و انصاف فراہم کر سکتا ہے۔ حتیٰ کہ خود ساختہ قوانین سے عدل فراہم کرنے والوں کو سورۃ المائدۃ (آیات ۴۴' ۴۵' ۴۷ میں) کافر' فاسق اور ظالم قرار دیا گیا ہے۔ ان اوصاف کے حاملین سے عدل و انصاف کی توقع کیسے رکھی جا سکتی ہے؟ یہ تو خود کہتے ہیں کہ ممتاز قادری کو دین اسلام کے قانون کے مطابق جو اللہ کا قانون ہے' سزائے موت نہیں دی جا سکتی' لیکن ملکی قانون اور دستور اس کو سزائے موت کا حق دار ٹھہراتا ہے۔ عدل و انصاف کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

﴿وَلَوْ اَنَّهُمْ اَقَامُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْهِمْ مِّنْ رَّبِّهِمْ لَاَكَلُوْا

مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَمِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِهِمۡ ؕ مِنۡهُمۡ اُمَّةٌ مُّقۡتَصِدَةٌ ؕ وَكَثِيۡرٌ مِّنۡهُمۡ سَآءَ مَا يَعۡمَلُوۡنَ ﴿۶۶﴾ (المائدۃ)

''اور اگر یہ تورات کو اور انجیل کو اور اس کو جو کچھ نازل کیا گیا تھا ان کے رب کی طرف سے نافذ کرتے تو یہ کھاتے اپنے اوپر سے بھی اور اپنے پاؤں کے نیچے سے بھی۔ ان میں ایک گروہ درمیانی راہ (دین) پر چلتا ہے اور ان میں سے اکثر بہت برے عمل کرتے ہیں۔''

اس آیت کی روشنی میں ہمارے لیے حکم یہ ہے کہ اگر ہم قرآن مجید اور سُنّتِ رسول ﷺ کو نافذ کریں تو یہ بشارتیں ہمارے لیے بھی ہیں۔ اگر ہم حدود اللہ کو نافذ کر دیں تو ہر جانب سے اس کی رحمتوں کی بارش ہوگی۔ اس کے لیے اُسوۂ ابراہیمی علیہ السلام کی پیروی کی ضرورت ہے' جس کے مطابق اللہ کے حکم پر اگر آگ میں چھلانگ لگانا پڑے یا بیٹے کے گلے پر چھری چلانا پڑے تو اس سے دریغ نہ کیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

﴿اِنَّ اللّٰهَ يَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ وَالۡاِحۡسَانِ وَاِيۡتَآئِ ذِى الۡقُرۡبٰى﴾ (النحل: ۹۰)

''اللہ تعالیٰ عدل و احسان اور قریبی رشتہ داروں کے حقوق کی ادائیگی کا حکم دیتا ہے۔''

عدل کے معنی ہیں کہ جو جس کا جائز حق اور مقام ہے' اس کو دیا جائے۔ اس لیے ہر فرد کو حقوق کی ادائیگی کی فکر ہونی چاہیے اور مرنے سے پہلے پہلے اپنے ذمہ حقوق کی ادائیگی کے لیے بے چین ہونا چاہیے۔

(۵) ناگہانی آفات و مصائب: پانچواں مسئلہ ناگہانی آفات و مصائب کا ہے۔ وہ مصائب زلزلے' سیلاب اور ڈینگی کے ہوں یا اندرونی خلفشار یا کسی بیرونی قوتوں کے حملہ سے پیدا ہو رہے ہوں' ان کے لیے قرآنی نسخۂ شفا درج ذیل ہے:

﴿بَلٰٓى ۙ اِنۡ تَصۡبِرُوۡا وَتَتَّقُوۡا وَيَاۡتُوۡكُمۡ مِّنۡ فَوۡرِهِمۡ هٰذَا يُمۡدِدۡكُمۡ رَبُّكُمۡ بِخَمۡسَةِ اٰلٰفٍ مِّنَ الۡمَلٰٓئِكَةِ مُسَوِّمِيۡنَ ﴿۱۲۵﴾﴾ (آل عمران)

''کیوں نہیں (اے مسلمانو!) اگر تم صبر اور تقویٰ اختیار کرو اور وہ تم پر یکبارگی حملہ آور ہو جائیں تو اللہ تعالیٰ تمہاری مدد پانچ ہزار فرشتوں سے کرے گا جو نشان زدہ گھوڑوں پر آئیں گے۔''

یعنی صبر اور تقویٰ کا دامن اگر ہم تھام لیں تو ناگہانی مصیبتوں میں اللہ تعالیٰ فرشتوں کی ڈیوٹی لگا دے گا کہ جاؤ اور میرے بندوں کی حفاظت کرو۔

درج بالا گزارشات میں یہ بات سامنے آئی کہ ہم اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے جن مسائل

میں گھرے ہوئے ہیں ان سے نکلنے کے لیے جو ذرائع ہمیں فراہم کیے گئے وہ تین ہیں:

(۱) ایمان (۲) تقویٰ (۳) صبر

نظامِ جمہوریت کی تباہ کاریاں

آج ہمیں ایسے نظامِ اجتماعی کی ضرورت ہے جس میں ان چیزوں کو پروان چڑھایا جائے' جبکہ ہمارے اوپر ۶۴ سال سے جو نظام مسلّط ہے وہ جمہوریت کا نظام ہے۔ جمہوری قدروں اور جمہوریت کو مضبوط کرنے کا ہر وقت ڈھنڈورا پیٹا جا رہا ہے' لیکن ذرا جائزہ لیں کہ اس جمہوریت نے ہمیں کیا دیا ہے؟

(۱) ۶۴ سالہ تاریخ میں آدھا عرصہ جمہوریت پسند عناصر کی حکمرانی رہی اور آدھا عرصہ ملک ڈکٹیٹرشپ کا شکار رہا۔ ڈکٹیٹرشپ کو موقع فراہم کرنے والے بھی یہی لوگ ہیں جو جمہوریت کی پوجا کرنے والے ہیں۔ انہی لوگوں نے ڈکٹیٹرشپ کو آوازیں دیں اور پھر انہی کے ہاتھوں شہدائے جمہوریت وجود میں آئے —— منصبِ شہادت اللہ کے ان انعام یافتہ بندوں کو عطا کیا جاتا ہے جو اس کے دین کی سربلندی کے لیے اس کے نام پر اپنی گردن کٹا دیں۔ کسی جرم کے بدلے میں پھانسی پانے والے شخص یا غیر محرموں کے ہجوم میں نعرے لگاتی عورت بم دھماکے میں ماری جائے تو اس کو شہید نہیں کہہ سکتے۔ اگر ایسا کریں گے تو گویا دینی شعائر کا مذاق اڑانے والی بات ہوگی۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے گورنر کا عہدہ حکومت کی طرف سے دیا جاتا ہے اور اگر کوئی خود گورنر کہلوانے لگے تو اس کو جیل کی ہوا کھانی پڑے گی یا دماغی امراض کے ہسپتال میں داخل ہونا پڑے گا۔

(۲) اس جمہوریت کے تحت ہی ہمارا معاشرہ لسانی' علاقائی اور نسلی اکائیوں اور تفریق کا شکار ہوا اور یہ جمہوریت ہی ملک عزیز میں فرقہ واریت کا سب سے بڑا سبب ہے۔

(۳) سیکولر سیاسی جماعتوں کی قیادتوں نے ملک کو لوٹا اور دینی سیاسی جماعتوں نے دین کو لٹایا اور آخرت کو گنوایا۔ ان کے لیے فرمانِ الٰہی سچا ثابت ہوا: ﴿خَسِرَ الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةَ﴾ یعنی ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کا خسارہ ہے۔

(۴) جمہوریت مسلمان معاشرہ میں غلط عقائد و نظریات کو دماغوں میں ڈال رہی ہے۔ ہمارے وزیراعظم صاحب فرماتے ہیں کہ جمہوریت پر میرا یقین ہے' طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں' اور پارلیمنٹ قانون ساز ادارہ ہے۔ جبکہ ہمارا یقین اللہ' اللہ کے رسول ﷺ

اور آخرت پر ہے‘ طاقت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذاتِ بابرکات ہے‘ اور قانون سازی اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کا حق ہے۔

(۵) اس جمہوریت کے تحت لوگوں کو جمہوری رویے اپنانے کی مسلسل تلقین کی جارہی ہے جس کے تحت حُریتِ فکر‘ تحمل اور برداشت کو فروغ دیا جارہا ہے۔ لیکن یہ سب کسی خیر کے لیے نہیں‘ بلکہ یہ حُریتِ فکر خیر کے خلاف ہرزہ سرائی اور تحمل و برداشت شر کو سر کی آنکھوں سے دیکھ کر خاموش رہنے کا نام ہے۔ اس کے تحت ہر خیر کا دروازہ بند اور شیطنت کا دروازہ کھولا جاتا ہے۔

اسی حریتِ فکر کے تحت ملک عزیز کے حکمرانوں نے دینی شعائر کا مذاق اڑانا شروع کر دیا تھا۔ وہ تو اللہ بھلا کرے غازی ممتاز قادری کا کہ اس کے ایک ہی وار سے ان حریت فکر کے عَلَم برداروں کے ہوش ٹھکانے آ گئے‘ بلکہ پوری دنیا کے بد دماغوں کو ایک مؤثر پیغام پہنچ گیا۔ اسی تحمل و برداشت کے رویوں کی تعلیم کا اگلا سبق امریکی سفارت خانے میں ہم جنس پرستوں کی کانفرنس منعقد کر کے دیا گیا ہے۔ جمہوریت کے ان پرستاروں کو ہوش کے ناخن لینا چاہئیں‘ اس لیے کہ ان کا تعلق ایک مسلمان معاشرے سے ہے۔

یاد کیجیے تحفظِ حقوقِ نسواں کے لیے قاہرہ اور پھر بیجنگ میں ہونے والی کانفرنسوں کے اعلامیوں کو‘ جن میں حرام کاری کرنے والی خواتین کو معاشرے میں باعزت محنت کشوں کا مقام دینے کی سفارش کی گئی تھی۔ پاکستان میں ہم جنس پرستوں کی کانفرنس کے ذریعے یہی پیغام دیا گیا ہے کہ تمہیں ایسی کانفرنس میں شرکت کا دعوت نامہ ملے یا اس کی صدارت کی دعوت دی جائے تو اس کو اپنی سعادت سمجھنا۔ یہ تحمل اور برداشت کے سبق اسی لیے دیے جارہے ہیں۔

ان جمہوری رویوں کی آخری منزل پوری قوم کو عملِ قومِ لوط تک پہنچانا ہے۔ اِسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ ..... نَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ ذٰلِكَ۔

دوسری طرف جو ملک جمہوریت کے بابے کہلاتے ہیں ان کی ایک جھلک ملاحظہ کیجیے:

(ا) ان ملکوں میں عورتوں کے برہنہ پھرنے پر کوئی پابندی نہیں ہے‘ لیکن کسی مسلمان عورت کا حجاب قابل قبول نہیں۔

(ب) نائٹ کلب تو سرعام چل سکتے ہیں‘ لیکن مساجد کے مینار بلند کرنا ان کے لیے ناقابلِ قبول ہے۔

(ج) ہم جنس پرستوں اور بدکردار عورتوں کو باعزت مقام دینے کی تحریکیں چلتی ہیں‘ جبکہ وہ ہستی جس کے مقام اور مرتبے کو اس طرح پہچانتے ہیں جس طرح اپنے بیٹوں کو‘ جو سرورِ

کائنات ﷺ ہیں‘ ان کے کارٹون شائع کرتے ہیں اور ہمیں اپنے ملک میں ان کے لیے تحفظِ ناموسِ رسالت ﷺ کی تحریک چلانا پڑتی ہے۔

جمہوریت پسند عناصر ترکی میں بہتر تبدیلی کی مثال دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ یہ جمہوریت سے حاصل ہوئی ہے۔ اس کے متعلق ہمیں جان لینا چاہیے:

(۱) اس تبدیلی سے کیا شریعت کا نظام نافذ ہو گیا ہے؟ ابھی منزل بہت دور ہے۔ ہمیں دعا کرنا چاہیے کہ واقعی خالص اسلامی حکومت وجود میں آ جائے۔

(۲) اس تبدیلی کے پیچھے ایک باہمت شخصیت فتح اللہ گولن اور اس کی بتیس سالہ تعلیمی و تربیتی جدّوجہد ہے‘ جس نے ترک معاشرہ کی کایا پلٹنے میں اصل کردار ادا کیا ہے‘ جبکہ جمہوریت تو بس ایک بے جان میکنزم ہے‘ اس کے علاوہ کچھ بھی نہیں۔

کیا اس سب کے باوجود بھی ہمارے ملک کی خالص سیاسی جماعتیں اور بالخصوص دینی سیای جماعتیں جمہوریت کو مضبوط کرنے اور اس کی پوجا کرنے سے باز نہیں آئیں گی؟ جمہوریت تو بس ایک نام ہے۔ اس کا کوئی صحیفہ نہیں ہے‘ اس کی اپنی کوئی شریعت نہیں ہے‘ اس کا کوئی ضابطہ اخلاق نہیں ہے۔ نہ ہی خود سے کوئی مؤثر کن طاقت ہے کہ کسی پر ماری جائے تو اس نظام کا حلیہ بگاڑ دے یا اس کو تبدیل کر دے۔ یہ تو ایک بے جان میکنزم ہے جس کے ذریعے عوام الناس میں سے کچھ کو اوپر لا کر ان کے ہاتھوں میں اختیارِ حکمرانی دے دیا جاتا ہے‘ لہٰذا جیسے عوام الناس ہوں گے ویسے ہی لوگ اٹھ کر اقتدار کی مسند پر بیٹھ جائیں گے۔ اصل چیز تو لوگوں کی تربیت اور ان کی شخصیت اور کردار سازی ہے۔ یہ اصل کام ہے جو کرنے کا ہے۔

اسلامی نظامِ تعلیم و تربیت کا احیاء: وقت کی اہم ترین ضرورت

قرآن کریم میں ذریعہ تعلیم و تربیت کے چار نکات بیان فرمائے گئے ہیں:

﴿يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (البقرۃ:۱۵۱)

”وہ (نبی اکرم ﷺ) تلاوت کرتا ہے تم پر ہماری آیات اور تمہارا تزکیہ کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔“

جبکہ ہمارا نظام‘ اِلا ماشاء اللہ‘ سارے کا سارا بنی اسرائیل کے نظامِ تعلیم کے رُخ پر چل رہا ہے‘ جس کے بارے میں فرمانِ الٰہی ہے:

﴿وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ﴾ (البقرۃ:۱۰۲)

''اور وہ سیکھتے وہ ہیں جو انہیں نقصان دیتا ہے اور فائدہ نہیں دیتا۔''

انہوں نے جادو سیکھنے کے ادارے بنا لیے تھے' جا بجا اکیڈمیز قائم کر لی تھیں' ٹریننگ سنٹر بنا لیے تھے۔ غور کیجیے کہ ہمارے تعلیم و تربیت کے ادارے' بالخصوص مخلوط ادارے اور پھر ذرائع ابلاغ ہمیں کیا دے رہے ہیں؟ الیکٹرانک میڈیا کا اکثر حصہ جھوٹ پر مبنی ہے۔ فلمیں' ڈرامے' گانے اور انٹرٹینمنٹ کی ساری صورتیں جھوٹ پر مبنی ہیں۔ اس جھوٹ سے کیا علم کی روشنی پھیل سکتی ہے؟ یہ جھوٹ پسندی بھی بنی اسرائیل کے زوال کا سبب تھی اور وہ تو جھوٹ کے رسیا تھے۔ لہٰذا جھوٹ سے تعلیم و تربیت کے مقاصد پورے نہیں ہو سکتے' بلکہ یہ سارے کا سارا جھوٹ جہالت کو پھیلانے کا ذریعہ بنتا ہے۔ ہمیں اپنے نظامِ تعلیم و تربیت کی اصلاح کی ضرورت ہے۔

دینی قوتوں کے کرنے کا اصل کام یہ ہے کہ وہ ذہنی انقلاب کے لیے قرآن و سنت کے علوم کو عام کریں۔ یہ وقت کی اہم ترین ضرورت ہے اور بیداری اور شعور پیدا کرنے کا واحد راستہ۔ لیکن طریقہ تعلیم انہی نکات کی بنیاد پر ہو جن پر رسول اللہ ﷺ نے عمل کیا تھا۔ پھر اس تربیت کے نتیجے میں ایسی شخصیات اور کردار وجود میں آئیں جو ایمان' تقویٰ' صبر اور عدل کے حامل ہوں۔

ایمان: ایمان بذاتِ خود ایک دولت اور ایک قوت ہے۔ سورۃ المائدۃ کی آیت ۱۲ ملاحظہ فرمائیے:

وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّیْ مَعَكُمْ ؕ لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِیْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَیِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِیْلِ ﴿۱۲﴾

''اور اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ اگر تم نماز قائم کرو گے' اور زکوٰۃ دو گے' اور میرے رسولوں پر ایمان رکھو گے' اور (جاں نثاری کے جذبے کے ساتھ عزت بھری) ان کی مدد کرو گے' اور اللہ کو قرضہ حسنہ دو گے' تو میں ضرور تم سے تمہاری برائیاں دور کر دوں گا اور ضرور تمہیں باغات میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے نہری بہتی ہوں گی۔ پس جس نے اس کے بعد کفر کیا وہ سیدھی راہ سے بھٹک گیا۔''

اس آیت مبارکہ میں ایمان کے پانچ تقاضوں کے ساتھ تین بڑی بشارتیں دی گئی ہیں:

(۱) کائنات کی سپر پاور کا ساتھ نصیب ہو جائے گا۔

(۲) سارے دلدر دور ہو جائیں گے۔

(۳) انجام کار بہترین نصیب ہوگا' یعنی ہمیشہ کی جنت حصے میں آئے گی۔

تقویٰ: اس کا سادہ مفہوم خدا خوفی ہے' جبکہ قرآن مجید کے بعض دوسرے مقامات کی روشنی میں تقویٰ کے جامع مفہوم میں انسانی اخلاق کا حصول اور ان کو پروان چڑھانے کا نام تقویٰ ہے (البقرۃ:۱۷۷)۔ اور یہ تقویٰ ہی مقاماتِ بلند کے حصول کے لیے قوتِ محرکہ ہے۔ (المائدۃ:۹۳)

صبر: اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اطاعت میں چلتے ہوئے چھوٹی' بڑی' داخلی اور خارجی مشکلات کو جھیلنے اور برداشت کرنے کا نام صبر ہے۔

عدل: شریعت اسلامی کے نفاذ کا نام عدل ہے' جس کا نکتہ اوّل یہ ہے کہ معاشرہ پر شریعت کے نفاذ سے پہلے انسان اپنی ذات پر اللہ کا قانون نافذ کرنے والا بن جائے۔ اس طرح کہ لوگ پھر امر بالمعروف و نہی عن المنکر کے فریضہ کو ادا کرتے اور ایک قیادت کے پیچھے چلتے ہوئے معاشرہ کی اصلاح اور نظامِ باطل کو نظامِ حق میں بدلنے کی منظّم جدّوجہد میں لگ جائیں۔ ان کی یہ مطالباتی تحریک اتنی شدید مزاحمتی تحریک میں بدل جائے کہ جمہوریت کے پجاریوں اور باطل کے حمایتیوں کو گھٹنے ٹیکنے پڑیں۔

وہ لوگ جو ایمان' تقویٰ' صبر اور عدل کے اوصاف کے حامل ہوں گے ان کی فکر جمہوریت کی مضبوطی نہیں ہوگی بلکہ قرآن و سنت کی بالادستی ہوگی۔ اقتدار کی رسہ کشی ان کا مسئلہ نہ ہوگی' بلکہ ان کا مسئلہ باطل اقتدار کا وجود ہوگا جسے وہ ختم کرنے کے درپے ہوں گے۔ انہی میں سے ایسے حکمران وجود میں آئیں گے جن کے بارے میں سورۃ الحج میں فرمایا گیا:

﴿اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ ﴿۴۱﴾﴾

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم زمین میں ان کو تمکن عطا کریں تو نماز قائم کریں گے' زکوٰۃ دیں گے' نیکی کا حکم دیں گے اور برائی سے روکیں گے۔ اور انجام کار تو اللہ ہی کے لیے ہے۔''

اور پھر عہدِ فاروقی کا احیا انہی کے ہاتھوں سے ہوگا اور یہی لوگ خلافت علیٰ منہاجِ النبوۃ کا ذریعہ بنیں گے۔ جو ذاتِ پاک ہر روز بے جان انڈے سے سانس لیتے ہوئے' دھڑکتے دل کے ساتھ چہچہاتے ہوئے پرندے کو نکالتا ہے' اس کی قدرت سے یہ انقلاب بھی ممکن ہے۔ وَمَا ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ بِعَزِیْزٍ!

❁❁❁

موجودہ عیسائیت

دینِ مسیحؑ یا سینٹ پال کی تحریفات؟

وقار احمد ☆

کیا موجودہ عیسائیت کے بنیادی عقائد اور عبادات کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیمات سے ذرا سا بھی تعلق ہے؟ آیئے! دیکھتے ہیں اس معاملے میں بائبل کیا کہتی ہے۔

اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ نے جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کی ہدایت و رہنمائی کے لیے رسول بنا کر بھیجا تو انہوں نے بھی تمام نبیوں اور رسولوں کی مانند لوگوں کو اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ ہی کی توحید کی دعوت دی اور آخرت سے خبردار کیا' جبکہ شریعت کے طور پر شریعتِ موسوی علیہ السلام ہی کو جاری رکھا جو کہ اس وقت اپنی درست حالت میں موجود تھی اور بنی اسرائیل اس پر کاربند تھے۔ اسی وجہ سے بعینہٖ انہی تعلیمات پر تمام حواری بھی عمل کرتے تھے اور اسی طرف لوگوں کو دعوت دیتے تھے' لیکن حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد ساؤل نامی شخص' جو کہ کٹر فریسی یہودی تھا اور تمام زندگی حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے پیروکاروں کا سخت دشمن رہا تھا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کو قید خانوں میں سخت اذیت ناک سزائیں دلواتا تھا' یہاں تک کہ انہیں تڑپا تڑپا کر قتل تک کروا دیا کرتا تھا' اُس نے یہ دعویٰ کیا کہ دمشق کے راستے میں جاتے ہوئے بادلوں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام (خداوند) نے مجھے پکار کر عیسائیت اختیار کرنے اور اس کے لیے کام کرنے کو کہا ہے۔ اس پر اس نے عیسائیت اختیار کر لی اور اپنا نام پال رکھا (یہی شخص آج کل سینٹ پال (پولس) کے نام سے معروف ہے)۔ اس کے فوری بعد وہ تین سال کے لیے عرب چلا گیا اور علم حاصل کرنے کے لیے حواریوں سے بالکل نہیں ملا۔ واپس آ کر برنباس حواری سے ملا اور بہت دلیرانہ انداز سے عیسائیت کی تبلیغ کی۔ باقی تمام حواری اس سے خوف

☆ مدیر ''اذان''، فیصل آباد

زدہ تھے اور اس پر یقین نہیں کرتے تھے' مگر برنباس حواری نے انہیں مطمئن کیا۔

کچھ عرصہ سینٹ پال (پولس) حواریوں کے ساتھ مل کر تبلیغ کرتا رہا اور ایک بڑے اور بااثر مبلّغ کے طور پر نمایاں ہو گیا۔ پھر یروشلم کونسل میں جب یہ معاملہ پیش ہوا کہ غیر مذہب کے مشرکوں کے دین قبول کرنے کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ ختنہ کا معاملہ ہے تو اس کا حل یہ نکالا گیا کہ ابھی وقتی طور پر ختنے پر اصرار نہ کیا جائے بلکہ انہیں عیسائیت قبول کرنے دیں۔ یہ فروعی معاملات ہیں' ان پر اس وقت اتنا زور نہ دیں کہ لوگ دین جیسی نعمت سے سرفراز نہ ہو سکیں۔

لیکن اس کونسل سے واپس آ کر سینٹ پال (پولس) نے بالکل مختلف انداز میں تبلیغ شروع کر دی اور شریعت کو بتدریج منسوخ کرنے کے راستے پر چل پڑا۔ اس مسئلہ پر اس کے حواریوں سے شدید اختلافات پیدا ہو گئے کیونکہ وہ سب حواری تو اسی دین کی دعوت دے رہے تھے جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لے کر آئے تھے' جبکہ اس کی دعوت بتدریج مختلف ہوتی جا رہی تھی۔ اس بات پر اس کی برنباس حواری سے بہت زیادہ تلخ کلامی ہو گئی اور برنباس اسے چھوڑ کر چلا گیا۔ حواریوں نے اس کی تعلیم کے ردّ کے لیے مختلف علاقوں میں لوگوں کو قائل کرنا شروع کیا۔ اس طرح کئی شہروں کے لوگ سینٹ پال (پولس) سے متنفّر ہو گئے' کیونکہ وہ یہ کہتے تھے کہ دیکھو ہم سب حواری مل کر اسی دین کی طرف بلا رہے ہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام لائے تھے جبکہ سینٹ پال (پولس) کی دعوت بالکل الگ ہے۔ اس کے بعد سینٹ پال (پولس) نے حواریوں سے مکمل علیحدگی کے بعد مختلف علاقوں کے لوگوں کو تبلیغ کے لیے خطوط لکھے اور ان میں اپنے نئے عقائد کو بیان کیا۔ پھر تمام تر شریعت موسوی علیہ السلام کو لعنت قرار دیتے ہوئے منسوخ کر دیا' جس کی طرف حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور اُن کے تمام حواری دعوت دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام تر تحریف کے باوجود موجودہ اناجیل میں سے عیسائیت کے موجودہ عقائد کی کوئی تائید نہیں ملتی سوائے یوحنا کی انجیل کے جس سے موجودہ عقائد کو اخذ کرنے کی کوشش کرتے ہیں' جبکہ اتفاق سے انجیل یوحنا ہی ایک ایسی انجیل ہے جس کی اصلیت میں خود عیسائیوں کو ہمیشہ شک رہا ہے۔ دوسری صدی ہی سے عیسائیوں میں ایک بڑی جماعت اس انجیل کو یوحنا کی تصنیف ماننے سے انکار کرتی آئی ہے اور آخری زمانے میں تو اس انجیل کی اصلیت کا مسئلہ ایک مستقل دردِ سر بن گیا تھا۔ بیسیوں کتابیں اس کی اصلیت کی تحقیق کے لیے لکھی گئی ہیں۔ وہ عیسائی علماء جو اس انجیل کو درست مانتے ہیں اور اس کو مَن گھڑت ہونے کے الزام سے بچانا چاہتے ہیں' ہمارے زمانے میں ان کی تقریباً متفقہ رائے یہ ہو گئی ہے کہ اس

انجیل کا مصنف یوحنا بن زبدی حواری نہیں ہے بلکہ یوحنا بزرگ ہے (مزید تفصیلات اگلے صفحات میں ''انجیل یوحنا کی حقیقت'' میں پڑھیے)۔

موجودہ تمام تر عقائد جن پر ایمان لائے بغیر کوئی شخص عیسائی نہیں ہوسکتا' ان کے تمام تر دلائل اور تفصیلات کا ماخذ صرف اور صرف سینٹ پال (پولس) کے خطوط ہیں جن کی تعلیمات اسی کتاب مقدس (یعنی عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید یعنی موجودہ بائبل) کی باقی سب تعلیمات سے مختلف بلکہ اُلٹ ہیں۔ اس لیے اس وقت جو عیسائی ایک نجات دہندہ کا انتظار کررہے ہیں وہ خوب غور کرلیں کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منتظر ہیں یا سینٹ پال (پولس) کے؟ اگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منتظر ہیں تو پھر غور سے سن لیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی بھی اپنے منہ سے یہ نہیں کہا کہ میں خدا ہوں۔ عیسیٰ علیہ السلام نے تقریباً ۶۰ جگہ واضح الفاظ سے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کے اکیلے ہونے کی تعلیم دی اور حواری بھی یہی تعلیم دیتے تھے۔ انہی کی تعلیمات اور ان کی پیش کی ہوئی توحید کو ماننے والے ہی ان کے ساتھی بنیں گے۔

سینٹ پال (پولس) حواریوں سے تعلیم حاصل نہ کرنے اور بالکل مختلف تعلیمات پیش کرنے کی دلیل یہ دیتا ہے کہ مجھے چونکہ بادلوں میں سے خداوند (یعنی عیسیٰ علیہ السلام) نے خود پکار کر کہا اور روح القدس خود مجھے تعلیم دیتا ہے اس لیے مجھے کسی حواری سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ دلیل اس وجہ سے بالکل ہی قابل قبول نہیں ہے' کیونکہ:

(۱) وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے سے پہلے تک تمام عرصہ ان کی تعلیمات' ان کے حواریوں اور پیروکاروں کا سخت ترین دشمن بنا رہا۔

(۲) حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد یہ دعویٰ کیا' مگر جو تعلیمات پیش کیں وہ عیسیٰ علیہ السلام اور حواریوں کی تعلیمات کے بالکل الٹ تھیں۔

(۳) ان تعلیمات کو پیش کرنے کے بعد جب حواریوں سے اختلافات شدید ہوگئے تو پھر ان سے بھی علیحدہ ہوگیا۔

عیسائی حضرات اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے صرف یہ کام کرکے دیکھ لیں کہ اس وقت موجودہ اناجیل کو (ان میں ہونے والی تمام تر تحریف کے باوجود' جسے یہ خود بھی مانتے ہیں) اکٹھا کرلیں اور ان میں جن تعلیمات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے' انہیں علیحدہ لکھ لیں اور سینٹ پال (پولس) کے تمام خطوط کو اکٹھا کرکے ان میں جن تعلیمات پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے انہیں بھی علیحدہ لکھ لیں' بالآخر وہ مندرجہ ذیل نتائج پر پہنچیں گے:

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی توحید کی طرف دعوت دی	سینٹ پال (پولس) نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت اور تثلیث کی طرف دعوت دینا شروع کی۔
خود بھی شریعت موسوی علیہ السلام پر عمل کرتے تھے اور اسی کی دعوت دیتے تھے۔	خود شریعت پر عمل کرتا تھا' دوسروں کو رعایت دیتا تھا' پھر سرے سے اسے منسوخ ہی کردیا۔
بارہا اپنے ابن آدم ہونے کا اقرار کیا۔	انہیں خدا کا بیٹا قرار دیا' حلول و تجسّم' مصلوبیت اور حیاتِ ثانیہ کے عقیدے کی تعلیم دیتا تھا۔
حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے یہی بتایا کہ ایمان اور نیک اعمال پر ہی اخروی کامیابی کا دارومدار ہے۔	کفارے کے عقیدے کے بغیر نجات نہیں ہوسکتی اس کے لیے بپتسمہ یعنی علامتی طور پر ایک موت اور اس کے بعد زندگی لازمی ہے۔

یہ اور ایسے مزید اختلافات آپ کو بہت واضح نظر آئیں گے۔ بنیادی عقائد' عبادات اور تعلیمات کے اختلافات اس قدر شدید بلکہ ایک دوسرے کی ضد ہیں کہ اس بات کے علاوہ کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ سینٹ پال (پولس) جو اپنی پیش کی ہوئی تعلیمات کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کرتا ہے وہ اپنے اس دعویٰ میں سچا نہیں ہے۔ جبکہ موجودہ عیسائیت کا تمام تر ڈھانچہ عقائد سے لے کر عبادات تک یہ سب کا سب سینٹ پال نے سابقہ شریعت کو (جس پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام عمل پیرا تھے اور جس کی تعلیم دیتے تھے) منسوخ کرنے کے بعد تعمیر کیا۔

مندرجہ بالا تمام باتیں موجودہ بائبل یعنی ''کتابِ مقدس'' سے اخذ کی گئی ہیں۔ ان حوالوں کے لیے مولانا رحمت اللہ کیرانوی صاحب کی کتاب ''اظہارِ حق'' پڑھ لیں اور ان تمام حوالوں کی تصدیق ''کتابِ مقدس'' سے بھی کرلیں۔ یہ کتاب آج کل ''بائبل سے قرآن تک'' کے نام سے بازار میں دستیاب ہے' اس کی نئے سرے سے تزئین و آرائش کا کام مفتی تقی عثمانی صاحب نے کیا ہے۔ یہ اس موضوع پر ایک بہترین کتاب ہے۔ عیسائی حضرات کے پاس اب بھی موقع ہے غور کرلیں' اپنی پوری تحقیق کرلیں' اچھی طرح اس مذہب کی تصدیق کرلیں' جسے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کا پیش کردہ مذہب سمجھ رہے ہیں کہیں وہ درپردہ حضرت مسیح علیہ السلام کے دین سے بالکل مخالف کوئی راستہ تو نہیں ہے' کیونکہ وہ بھی ہماری طرح حضرت عیسیٰ یسوع مسیح ابن مریم علیہ السلام ہی کے منتظر ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام آسمانوں سے تشریف لائیں تو انہیں پہچاننے سے ہی انکار کردیں اور ان کی ساری کی ساری محنت اور عبادت و ریاضت ضائع ہوجائے' جسے وہ

حضرت مسیح علیہ السلام کی پیروی سمجھتے ہوئے کر رہے ہیں۔ کچھ حوالے مندرجہ ذیل ہیں۔

سینٹ پال (پولس) کے حالاتِ زندگی اس کی اپنی زبانی

یہ روم کے شہر ترسُس کا باشندہ تھا (جیسا کہ اعمال ۲۲: ۲۸ سے ظاہر ہوتا ہے)۔ اس کی ابتدائی زندگی کے ان مجمل اشاروں کے بعد اس کا سب سے پہلا تذکرہ ہمیں کتاب الاعمال ۵۸: ۷ میں ملتا ہے، جہاں اس کا نام ''ساؤل'' ذکر کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کتابِ اعمال کے تین ابواب میں اس کا کردار اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں اور اُن پر ایمان لانے والوں کا سخت دشمن تھا اور شب و روز انہیں تکلیفیں پہنچانے اور ان کی بیخ کنی میں مصروف۔ لیکن پھر اچانک اُس نے دعویٰ کیا کہ:

کتابِ اعمال، باب ۲۶، آیات ۹ تا ۱۹: ''میں نے بھی سمجھا تھا کہ یسوع ناصری کے نام کی طرح طرح سے مخالفت کرنا مجھ پر فرض ہے، چنانچہ میں نے یروشلم میں ایسا کیا اور سردار کاہنوں کی طرف سے اختیار پا کر بہت سے مقدسوں کو قید میں ڈالا اور جب وہ قتل کیے جاتے تھے تو میں بھی یہی رائے دیتا تھا اور ہر عبادت خانے میں انہیں سزا دلا دلا کر زبردستی اُن سے کفر کہلواتا تھا، بلکہ اُن کی مخالفت میں ایسا دیوانہ بنا کہ غیر شہروں میں بھی جا کر انہیں ستاتا تھا، اسی حال میں سردار کاہنوں سے اختیار اور پروانے لے کر دمشق کو جاتا تھا، تو اے بادشاہ! میں نے دوپہر کے وقت راہ میں یہ دیکھا کہ سورج کے نور سے زیادہ ایک نور آسمان سے میرے اور میرے ہم سفروں کے گرداگرد آ چمکا، جب ہم سب زمین پر گر پڑے تو میں نے عبرانی زبان میں یہ آواز سنی کہ اے ساؤل! اے ساؤل! تو مجھے کیوں ستاتا ہے! پینے کی آر پر لات مارنا تیرے لیے مشکل ہے۔ میں نے کہا: اے خداوند تو کون ہے؟ خداوند نے فرمایا: میں یسوع ہوں، جسے تو ستاتا ہے، لیکن اُٹھ، اپنے پاؤں پر کھڑا ہو کیونکہ میں اس لیے تجھ پر ظاہر ہوا ہوں کہ تجھے اُن چیزوں کا بھی خادم اور گواہ مقرر کروں جن کی گواہی کے لیے تو نے مجھے دیکھا ہے، اور اُن کا بھی جن کی گواہی کے لیے میں تجھ پر ظاہر ہوا کروں گا اور میں تجھے اس اُمت اور غیر قوموں سے بچاتا رہوں گا جن کے پاس تجھے اس لیے بھیجتا ہوں کہ تو اُن کی آنکھیں کھول دے تاکہ اندھیرے سے روشنی کی طرف اور شیطان کے اختیار سے خدا کی طرف رجوع لائیں اور مجھ پر ایمان لانے کے باعث گناہوں کی معافی اور مقدسوں میں شریک ہو کر میراث پائیں۔'' (یہ پولس یعنی سینٹ پال کی اس تقریر کا اقتباس ہے جو اُس نے اگرپا بادشاہ کے سامنے کی تھی)

کتاب اعمال، باب ۹، آیات ۲۶ تا ۳۰: ''اس (پولس) نے یروشلم میں پہنچ کر شاگردوں میں مل جانے کی کوشش کی، اور سب اس سے ڈرتے تھے کیونکہ اُن کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ شاگرد ہے، مگر برنباس نے اُسے اپنے ساتھ رسولوں کے پاس لے جا کر اُن سے بیان کیا کہ اس نے اس طرح سے راہ میں خداوند کو دیکھا اور اُس نے اس سے باتیں کیں، اور اس نے دمشق میں کیسی دلیری کے ساتھ یسوع کے نام سے منادی کی، پس وہ یروشلم میں اُن کے ساتھ آتا جاتا رہا اور دلیری کے ساتھ خداوند کے نام کی منادی کرتا تھا اور یونانی مائل یہودیوں کے ساتھ گفتگو اور بحث بھی کرتا تھا، مگر وہ اُسے مار ڈالنے کے درپے تھے اور بھائیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو اسے قیصریہ میں لے گئے اور ترسُس کو روانہ کر دیا۔''

گلتیوں کے نام خط، باب ۱، آیات ۱۱۔۲۱: ''اے بھائیو! میں تمہیں جتائے دیتا ہوں کہ جو خوشخبری میں نے سنائی وہ انسان کی سی نہیں، کیونکہ وہ مجھے انسان کی طرف سے نہیں پہنچی اور نہ مجھے سکھائی گئی، بلکہ یسوع مسیح کی طرف سے مجھے اس کا مکاشفہ ہوا۔''

فلپیوں کے نام خط، باب ۳، آیت ۵: ''آٹھویں دن میرا ختنہ ہوا، اسرائیل کی قوم اور بنیامین کے قبیلہ کا ہوں، عبرانیوں کا عبرانی، شریعت کے اعتبار سے فریسی ہوں۔''

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کبھی خدا ہونے کا دعویٰ نہیں کیا

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے کسی جگہ یہ نہیں فرمایا کہ میں درحقیقت خدا ہوں اور تمہارے گناہوں کو معاف کرنے کے لیے انسانی روپ میں حلول کر کے آ گیا ہوں۔ اس کے بجائے وہ ہمیشہ اپنے آپ کو ''ابن آدم'' کے لقب سے یاد کرتے رہے۔ انجیل میں ساٹھ (۶۰) جگہ آپ نے اپنے آپ کو ''ابن آدم'' قرار دیا۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے تثلیث کے عقیدے کو اپنی زندگی میں ایک مرتبہ بھی بیان نہیں کیا، اس کے برعکس وہ ہمیشہ توحید کی تعلیم دیتے رہے اور کبھی یہ نہیں کہا کہ ''خدا تین اقانیم سے مرکب ہے اور یہ تین مل کر ایک خدا ہیں'' (اقنوم کا معنی شخص (person) اور اقانیم اس کی جمع ہے)۔ خدا کی توحید کے بارے میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بے شمار ارشادات ہیں، ان میں سے دو مندرجہ ذیل ہیں:

انجیل مرقس، باب ۱۲، آیت ۲۹، انجیل متی، باب ۲۲، آیت ۳۶: ''اے اسرائیل سن! خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے اور تو خداوند اپنے خدا سے اپنے سارے دل اور اپنی ساری

جان اور اپنی پیاری عقل اور اپنی ساری طاقت سے محبت رکھ۔''

انجیل یوحنا' باب ۱۷' آیت ۳: ''اور ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔''

بائبل میں حضرت مسیح علیہ السلام کے لیے ''خداوند'' کا لفظ ان کی طرف ضرور منسوب ہے' لیکن یہ لفظ ''آقا'' اور ''استاذ'' کے معنی میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ انجیل کی کئی عبارتیں بھی اس بات پر دلالت کرتی ہیں کہ حواری حضرت مسیح علیہ السلام کو ''استاذ'' کے معنی میں ''خداوند'' اور ''رَبّی'' کہتے تھے۔

انجیل متی' باب ۲۳' آیات ۹ تا ۱۱: ''مگر تم رَبّی نہ کہلاؤ' کیونکہ تمہارا استاد ایک ہی ہے' اور تم سب بھائی ہو اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو' کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے' جو آسمانی ہے اور نہ تم ہادی کہلاؤ کیونکہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیح۔'' (نوٹ: یہاں باپ دراصل ربّ کے معنی میں استعمال ہوا ہے یعنی پالنے والا)

حضرت پطرس (سینٹ پیٹرز) حواریوں میں بلند ترین مقام کے حامل ہیں' وہ ایک مرتبہ یہودیوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں:

کتاب اعمال' باب ۲' آیت ۲۲: ''اے اسرائیلیو! یہ باتیں سنو کہ یسوع ناصری ایک شخص تھا' جس کا خدا کی طرف سے ہونا تم پر ان معجزوں اور عجیب کاموں اور نشانوں سے ثابت ہوا' جو خدا نے اس کی معرفت تم میں دکھائے' چنانچہ تم آپ ہی جانتے ہو۔''

اور کتابِ اعمال ہی میں ہے کہ ایک مرتبہ تمام حواریوں نے یک زبان ہو کر خدا سے مناجات کرتے ہوئے کہا:

کتاب اعمال' باب ۴' آیت ۲۷: ''کیونکہ واقعی تیرے پاک خادم یسوع علیہ السلام کے برخلاف جسے تو نے مسح کیا' ہیرودیس اور پنطیس' پیلاطس غیر قوموں اور اسرائیلیوں کے ساتھ اس شہر میں جمع ہوئے۔''

یہ اور ایسی ہی بہت سی عبارتیں اسی حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ حواریین حضرت مسیح علیہ السلام کو ''ایک شخص'' اور خدا کی طرف سے پیغمبر اور اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کا خادم (یعنی بندہ) اور مسیح سمجھتے تھے' اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

سینٹ پال (پولس) عقیدۂ تثلیث کا موجد

حضرت مسیح علیہ السلام سے لے کر آپ کے حواریوں تک کسی سے بھی تثلیث اور حلول کا عقیدہ

ثابت نہیں ہے بلکہ اس کے خلاف ان کی صریح عبارتیں موجود ہیں۔ سینٹ پال (پولس) وہ پہلا شخص ہے جس نے پوری وضاحت کے ساتھ تثلیث اور حلول کے عقیدے کو بیان کیا اور اس کی طرف لوگوں کو دعوت دی۔

جی ٹی مینلی کی تصریح کے مطابق گلتیوں کا خط تاریخی اعتبار سے سینٹ پال (پولس) کا پہلا خط تھا' جو اس نے حواریوں سے علیحدہ ہونے کے بعد لکھا۔ بقیہ تمام خطوط اس واقعہ کے بعد لکھے۔ انہی خطوط میں اس نے تثلیث' حلول وتجسّم' کفّارہ وغیرہ کے عقائد پیش کیے اور تورات کو منسوخ کیا۔ یہ اس کے ذاتی خیالات تھے جنہیں اس نے حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب کر کے موجودہ عیسائیت کی بنیاد رکھی۔

فلپیّوں کے نام خط' باب ۲' آیات ۶ تا ۱۱: ''اُس (مسیح) نے اگرچہ خدا کی صورت پر تھا' خدا کے برابر ہونے کو قبضہ میں رکھنے کی چیز نہ سمجھا' بلکہ اپنے آپ کو خالی کر دیا اور خادم کی صورت اختیار کی اور انسانوں کے مشابہ ہو گیا اور انسانی شکل میں ظاہر ہو کر اپنے آپ کو پست کر دیا اور یہاں تک فرمانبردار رہا کہ موت بلکہ صلیبی موت گوارا کی' اسی واسطے خدا نے بھی اُسے بہت سربلند کیا..... تاکہ یسوع کے نام پر ہر ایک گھٹنا ٹیکے..... اور خدا باپ کے جلال کے لیے ہر ایک زبان اقرار کرے کہ یسوع مسیح خداوند ہے۔''

کلسّیوں کے نام خط' باب ۱' آیت ۱۶: ''وہ (مسیح) دیکھے خدا کی صورت اور تمام مخلوقات سے پہلے مولود ہے کیونکہ اسی میں سب چیزیں پیدا کی گئیں' آسمان کی ہوں یا زمین کی' دیکھی ہوں یا اَن دیکھی' تخت ہوں یا ریاستیں' یا حکومتیں یا اختیارات' سب چیزیں اسی کے وسیلے سے اور اسی کے واسطے سے پیدا ہوئی ہیں۔''

کلسّیوں کے نام خط' باب ۲' آیت ۹: ''کیونکہ الوہیت کی ساری معموری اسی میں مجسّم ہو کر سکونت کرتی ہے۔''

شریعت کے بارے میں حضرت مسیح علیہ السلام کے اقوال

حضرت مسیح علیہ السلام نے متعدد ارشادات میں وضاحت کے ساتھ یہ فرمایا ہے کہ میرا مقصد تورات کی مخالفت کرنا نہیں ہے' بلکہ میں اس کی تصدیق کرتا ہوں' جبکہ اناجیل میں تو یہاں تک لکھا ہے کہ میں اس کو منسوخ کرنے نہیں آیا۔

متی کی انجیل' باب ۵' آیت ۱۷: ''یہ نہ سمجھو کہ میں توریت یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے

آیا ہوں' منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں' کیونکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ جب تک آسمان اور زمین ٹل نہ جائیں ایک نقطہ یا ایک شوشہ توریت سے ہرگز نہ ٹلے گا۔''

متی کی انجیل' باب ۵' آیت ۱۲: ''جو کچھ تم چاہتے ہو کہ لوگ تمہارے ساتھ کریں وہی تم بھی ان کے ساتھ کرو' کیونکہ توریت اور نبیوں کی تعلیم یہی ہے۔''

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام بنیادی طور پر تورات کو واجب العمل اور قابلِ احترام مانتے تھے۔

شریعت کے بارے میں سینٹ پال (پولس) کے اقوال

پولس کا تورات کے احکام کے بارے میں کیا نظریہ ہے؟ اس کے مندرجہ ذیل اقوال سے معلوم ہوگا:

گلتیوں کے نام خط' باب ۳' آیت ۱۳: ''مسیح جو ہمارے لیے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔''

گلتیوں کے نام خط' باب ۳' آیات ۲۳ تا ۲۵: ''ایمان کے آنے سے پیشتر شریعت کی ماتحتی میں ہماری نگہبانی ہوتی تھی اور اس ایمان کے آنے تک جو ظاہر ہونے والا تھا ہم اسی کے پابند رہے' پس شریعت مسیح تک پہنچانے کو ہمارا استاد بنی تا کہ ہم ایمان کے سبب سے راست باز ٹھہریں' مگر جب ایمان آ چکا تو ہم استاد کے ماتحت نہ رہے۔''

افسیوں کے نام خط' باب ۲' آیت ۱۵: ''اس نے جسم کے ذریعہ دشمنی یعنی وہ شریعت جس کے حکم ضابطوں کے طور پر تھے' موقوف کر دی۔''

عبرانیوں کے نام خط' باب ۷' آیت ۱۲: ''اور جب کہانت بدل گئی تو شریعت کا بھی بدلنا ضرور ہے۔''

عبرانیوں کے نام خط' باب ۸' آیت ۷: ''کیونکہ اگر پہلا عہد (یعنی تورات) بے نقص ہوتا تو دوسرے کے لیے موقع نہ ڈھونڈھا جاتا۔''

عبرانیوں کے نام خط' باب ۸' آیت ۱۳: ''جب اس نے نیا عہد کیا تو پہلے کو پرانا ٹھہرایا' اور جو چیز پرانی اور مدت کی ہو جاتی ہے وہ مٹنے کے قریب ہوتی ہے۔''

ان تمام اقوال کے ذریعہ پولس نے تورات کی عملی اہمیت بالکل ختم کر دی اور اس کے تمام احکامات کو منسوخ کر ڈالا۔

ختنہ کا حکم

ختنہ کا حکم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت سے چلا آ رہا ہے۔ تورات میں ہے:

کتاب پیدائش' باب ۱۷' آیات ۱ تا ۱۴: ''اور میرا عہد جو میرے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے اور جسے تم مانو گے سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے .....اور میرا عہد تمہارے جسم میں ابدی عہد ہوگا' اور وہ فرزند نرینہ جس کا ختنہ نہ ہوا ہو' اپنے لوگوں سے کاٹ ڈالا جائے کیونکہ اس نے میرا عہد توڑا۔''

احبار' باب ۱۲' آیت ۳: ''اور آٹھویں دن لڑکے کا ختنہ کیا جائے۔''

خود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھی ختنہ ہوا تھا' جس کی تصریح انجیل لوقا ۲:۲۱ میں موجود ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا کوئی ارشاد ایسا منقول نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ ختنہ کا حکم منسوخ ہو گیا ہے۔

ختنہ کے بارے میں سینٹ پال (پولس) کے نظریات

گلتیوں کے نام خط' باب ۵' آیت ۱: ''دیکھو میں پولس تم سے کہتا ہوں کہ اگر تم ختنہ کراؤ گے تو مسیح سے تم کو کچھ فائدہ نہ ہوگا۔''

اور آگے چل کر لکھتا ہے: ''کیونکہ نہ ختنہ کچھ چیز ہے' نہ نامختونی' بلکہ نئے سرے سے مخلوق ہونا۔''

کفّارہ کا عقیدہ

حضرت مسیح علیہ السلام کے کسی جملے سے عقیدہ کفارہ کا وہ مفہوم ثابت نہیں ہوتا جو آج کل رائج ہے' اور جن جملوں سے اس پر استدلال کیا گیا ہے ان کا سیدھا اور صاف مطلب کچھ اور ہے۔ ایب لارڈ کا بھی یہ کہنا تھا کہ کفارے کا مطلب صرف یہ ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی حیات و موت ہمدردی اور رحمدلی کا ایک مکمل سبق تھی۔ اب حواریوں کی طرف آیئے تو ان کا کوئی ایک بھی جملہ ایسا نہیں ہے جس سے عقیدۂ کفارہ کی سند ملتی ہو' لہٰذا پہلا وہ شخص جس نے عقیدۂ کفّارہ کو اس کے پورے فلسفہ کے ساتھ بیان کیا ہے' وہ پولس ہے۔

سینٹ پال (پولس) کا پیش کردہ کفّارے کا عقیدہ

رومیوں کے نام خط' باب ۵' آیات ۱۲ تا ۱۹: ''پس جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دنیا میں آیا اور گناہ کے سبب سے موت آئی' اور یوں موت سب آدمیوں میں پھیل گئی' اس لیے

کہ سب نے گناہ کیا' کیونکہ شریعت کے دیے جانے تک دنیا میں گناہ تو تھا' مگر جہاں شریعت نہیں وہاں گناہ محسوب نہیں ہوتا' تو بھی آدم سے لے کر موسیٰ تک موت نے ان پر بادشاہی کی جنہوں نے اس آدم کی نافرمانی کی طرح جو آنے والے کا مثیل تھا گناہ نہ کیا تھا' لیکن قصور کا جو حال ہے وہ نعمت کا نہیں' کیوں کہ جب ایک شخص کے قصور سے بہت سے آدمی مر گئے تو خدا کا فضل اور اس کی بخشش ایک ہی آدمی یعنی یسوع مسیح کے فضل سے پیدا ہوئی' بہت سے آدمیوں پر ضرور ہی افراط سے نازل ہوئی اور جیسا ایک شخص کے گناہ کرنے کا انجام ہوا بخشش کا ویسا حال نہیں' کیونکہ ایک ہی کے سبب سے وہ فیصلہ ہوا جس کا نتیجہ سزا کا حکم تھا' مگر بہتیرے قصوروں سے ایسی نعمت پیدا ہوئی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگ راست باز ٹھیرے' کیونکہ جب ایک شخص کے قصور کے سبب سے موت نے اس ایک کے ذریعہ سے بادشاہی کی تو جو لوگ فضل اور راست بازی کی بخشش افراط سے حاصل کرتے ہیں' ایک شخص یعنی یسوع مسیح کے وسیلے سے ہمیشہ کی زندگی میں ضرور ہی بادشاہی کریں گے..... کیونکہ جس طرح ایک ہی شخص کی نافرمانی سے بہت سے لوگ گنہگار ٹھہرے اسی طرح ایک کی فرمانبرداری سے بہت سے لوگ راست باز ٹھہریں گے۔''

بپتسمہ کے پیچھے موجود فلسفہ سینٹ پال (پولس) کے نزدیک

رومیوں کے نام خط' باب ۶' آیات ۳ تا ۶: ''کیا تم نہیں جانتے کہ ہم جتنوں نے مسیح یسوع میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا تو اس کی موت میں شامل ہونے کا بپتسمہ لیا۔ پس موت میں شامل ہونے کے بپتسمہ کے وسیلہ سے ہم اس کے ساتھ دفن ہوئے تاکہ جس طرح مسیح باپ کے جلال کے وسیلہ سے مردوں میں جلایا گیا' اسی طرح ہم بھی نئی زندگی میں چلیں..... چنانچہ ہم جانتے ہیں کہ ہماری پرانی انسانیت اس کے ساتھ اس لیے مصلوب کی گئی کہ گناہ کا بدن بیکار ہو جائے' تاکہ ہم آگے کو گناہ کی غلامی میں نہ رہیں۔''

عَشاءِ ربّانی

یہ عبادت عیسائی مذہب کی اہم ترین رسوم میں سے ہے' لیکن انجیل متی اور مرقس میں جہاں اس واقعہ کا تذکرہ ہے وہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف سے اس عمل کو ایک دائمی رسم بنا لینے کا کوئی حکم موجود نہیں ہے۔ یہ حکم بھی سب سے پہلے سینٹ پال (پولس) نے وضع کیا ہے' (کرنتھیوں ۱۱:۲۴) اور لوقا چونکہ پولس کا شاگرد ہے اس لیے اس نے بھی پولس کی تقلید کی ہے۔ یہ بات خود عیسائی علماء کو بھی تسلیم ہے' چنانچہ ایف سی برکٹ لکھتے ہیں:

''اگر آپ عشاءِ ربانی کا حال مرقس میں پڑھیں گے تو اس میں اس عمل کو آئندہ جاری رکھنے کا کوئی حکم آپ کو نہیں ملے گا' لیکن مقدس پولس جہاں یسوع کے اس عمل کا تذکرہ کرتا ہے وہاں ان کی طرف منسوب کر کے اس جملے کا اضافہ کرتا ہے کہ ''میری یادگاری میں یہی کیا کرو۔''

انجیل یوحنا کی حقیقت

یہاں ایک اعتراض پیدا ہو سکتا ہے' اور وہ یہ کہ حلول اور تجسم کا عقیدہ انجیل یوحنا کے بالکل شروع میں موجود ہے' اس کے الفاظ یہ ہیں: ''ابتدا میں کلام تھا' اور کلام خدا کے ساتھ تھا' اور کلام خدا تھا''۔ اور آگے چل کر لکھا ہے: ''اور کلام مجسم ہوا' اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا' اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال''۔ یہ یوحنا کی عبارت ہے' اور یوحنا چونکہ حواری ہیں' اس لیے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تجسّم کے عقیدے کا بانی پولس نہیں' بلکہ حواریوں میں سے یوحنا بھی اس کے قائل تھے۔ یہ اعتراض خاصا وزنی ہو سکتا تھا اگر انجیل یوحنا کم از کم اتنی مستند ہوتی جتنی پہلی تین اناجیل ہیں' لیکن اتفاق سے انجیل یوحنا ہی ایک ایسی انجیل ہے جس کی اصلیت میں خود عیسائیوں کو ہمیشہ شک رہا ہے۔ دوسری صدی ہی سے عیسائیوں میں ایک بڑی جماعت اس انجیل کو یوحنا کی تصنیف ماننے سے انکار کرتی آئی ہے اور آخری زمانے میں تو اس انجیل کی اصلیت کا مسئلہ ایک مستقل دردِ سر بن گیا تھا۔ بیسیوں کتابیں اس کی اصلیت کی تحقیق کے لیے لکھی گئی ہیں اور ہزاروں صفحات اس پر بحث و مباحثے میں سیاہ ہوئے ہیں۔ یہاں ہمارے لیے ان تمام بحثوں کا خلاصہ بیان کرنا بھی ممکن نہیں ہے' لیکن اس سلسلے میں چند اہم نکات کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے:

خود اس انجیل کی بعض اندرونی شہادتیں ایسی ہیں جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ کتاب یوحنا حواری کی لکھی ہوئی نہیں ہے' مثلاً یہ کہ اس کتاب کا لکھنے والا یقیناً کوئی یہودی عالم ہے اور یہودی خیالات و تصورات سے واقف ہے' لیکن یوحنا بن زبدی حواری اَن پڑھ اور ناواقف تھے۔ (جیسا کہ اعمال ۴:۱۳ سے معلوم ہوتا ہے) نیز انجیل یوحنا سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا مصنف کسی بڑے صاحبِ رسوخ و اقتدار خاندان سے تعلق رکھتا تھا' حالانکہ یوحنا بن زبدی حواری ماہی گیر اور دنیوی اعتبار سے کم حیثیت تھے۔ علاوہ ازیں چوتھی انجیل اپنے مضامین کے لحاظ سے بھی پہلی تین اناجیل سے تضاد رکھتی ہے اور اس کا اسلوب بھی بالکل

جداگانہ ہے۔ اس انجیل کو یوحنا کی تصنیف قرار دینے والا پہلا شخص آرینوس ہے' اور اس کے بارے میں عیسائی علماء کا خیال یہ ہے کہ وہ دقتِ نظر اور تنقید کے معاملے میں کوئی بہت زیادہ قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ لیکن وہ عیسائی علماء جو اس انجیل کو درست مانتے ہیں اور اس کو من گھڑت ہونے کے الزام سے بچانا چاہتے ہیں ہمارے زمانے میں ان کی تقریباً متفقہ رائے یہ ہوگئی ہے کہ اس انجیل کا مصنف یوحنا بن زبدی حواری نہیں ہے بلکہ یوحنا بزرگ ہے۔ جیمس میک کنن لکھتا ہے:

''یہ بات بہت قرین قیاس ہے کہ آرینوس نے جس کی حقیقت پسندی اور تنقیدی نظر نمایاں نہیں ہے' یوحنا حواری کو یوحنا بزرگ کے ساتھ خلط ملط کر دیا ہے۔''

اور ہمارے ملک کے مشہور پادری اور صاحب تصانیف عیسائی عالم آرچ ڈیکن برکت اللہ صاحب لکھتے ہیں:

''پس ہم اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ یہ روایت کہ انجیل چہارم مقدس یوحنا رسول بن زبدی کی تصنیف ہے' صحیح نہیں ہوسکتی۔''

انہوں نے اپنی کتاب میں بڑی تفصیل کے ساتھ اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ چوتھی انجیل کا مصنف ''یوحنا رسول'' نہیں، ''یوحنا بزرگ'' تھا' کیونکہ اس کے اندر بیان کردہ مضامین کی وجہ سے چوتھی انجیل کو یوحنا بن زبدی حواری کی تصنیف قرار دینے کے بعد اس کی اصلیت سخت خطرے میں پڑ جاتی ہے۔ لیکن اگر اس انجیل کو یوحنا بزرگ کی تصنیف قرار دے دیا جائے تو مندرجہ ذیل سوالات پیدا ہوتے ہیں:

۱) یوحنا بزرگ کون تھا؟

۲) باقی انجیلوں میں اس کا ذکر کیوں نہیں ہے جبکہ ان انجیلوں میں مریم' مرتھا' لعزر اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی گدھی تک کا ذکر موجود ہے اور اس چوتھی انجیل میں مصنف نے بے شمار جگہ اپنے لیے ''وہ شاگرد جس سے یسوع محبت کرتا تھا'' کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

۳) حضرت مسیح علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے بعد وہ کہاں گیا؟ کتاب اعمال میں حواریوں کا مفصّل حال موجود ہے جبکہ ''یوحنا بزرگ'' نام کا کوئی شخص نظر نہیں آتا۔

۴) یہ بھی نہیں کہا جاسکتا کہ رفع آسمانی کے فوراً بعد اس کی وفات ہوگئی کیونکہ وہ تمام عیسائی علماء جو یوحنا بزرگ کو یوحنا بن زبدی سے الگ شخصیت مانتے ہیں وہ اس بات کے قائل

ہیں کہ یوحنا بزرگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے کافی عرصہ بعد تک زندہ رہا۔

مذکورہ بالا اشارات سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ جاتی ہے کہ چوتھی انجیل کا مصنف نہ یوحنا زبدی حواری ہے' نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کوئی اور قابل ذکر شاگرد' بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ چوتھی انجیل کا مصنف حواریوں کے بہت بعد کا کوئی شخص ہے جس نے پولس یا اس کے کسی شاگرد سے علم حاصل کیا تھا۔ بلکہ فرانسیسی انسائیکلوپیڈیا میں تو یہاں تک لکھا گیا ہے کہ پوری انجیلِ یوحنا پولس کی تصنیف ہے جسے اس نے یوحنا حواری کی طرف منسوب کر دیا ہے (دیکھئے مقدمہ انجیل برنباس از سید رضا مصری مرحوم' مطبوعہ قاہرہ)۔

یروشلم کونسل

یروشلم کونسل کا انعقاد اور اس میں ہونے والے فیصلوں کے بعد ہی وہ دراڑ پڑنی شروع ہوئی تھی جو بالآخر سینٹ پال (پولس) کی دوسرے حواریوں سے مکمل علیحدگی کے نتیجے میں مکمل ہوئی۔ اس بارے میں کچھ اشکالات ہیں جنہیں حل کرنا ضروری ہے' جن میں ایک یہ کہ جناب پطرس (سینٹ پیٹرز) جنہیں کیتھولک چرچ ہمیشہ سے سردارِ کلیسا تسلیم کرتا آیا ہے اور انہیں تمام حواریوں میں سب سے اونچا مرتبہ حاصل ہے' ان کے دو خطوط جو کہ عہد نامہ جدید میں شامل ہیں وہ سینٹ پال (پولس) کی تعلیمات کی تائید کرتے ہیں' ایسا کیوں ہے؟ اور یروشلم کونسل کے بعد کتابِ اعمال سے اُن کا تذکرہ کیوں بالکل ہی غائب ہوگیا؟

دوسرے یہ کہ برنباس جیسے عالی حوصلہ اور دینِ مسیح علیہ السلام کی تبلیغ کے لیے انتہائی پرجوش حواری یروشلم کونسل کے فوری بعد سینٹ پال (پولس) سے اختلافات اور شدید تلخ کلامی کے بعد کہاں غائب ہوگئے تھے کہ بعد میں پوری کتابِ اعمال میں ان کا کوئی تذکرہ نہیں ملتا؟ اس کے علاوہ یروشلم کونسل اور یعقوب بن یوسف نجار کا تذکرہ بھی اہم ہے' جنہوں نے یروشلم کونسل کی صدارت کی تھی۔

یعقوب بن یوسف نجار جنہیں انجیل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بھائی قرار دیا گیا ہے (متی ۱۳:۵۵) اناجیل ہی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام کی زندگی میں آپ پر ایمان نہیں لائے تھے (دیکھئے مرقس ۳:۲۱' یوحنا ۷:۵) یا تو آخر وقت میں ایمان لائے تھے یا اُس وقت جب کہ بقول سینٹ پال (پولس) حضرت مسیح علیہ السلام کی حیاتِ ثانیہ (resurrection) کے موقع پر انہیں نظر آئے (کرنتھیوں ۱۵:۷)۔ کتاب اعمال کے انداز سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ

انہیں یروشلم کی کلیسا کا صدر منتخب کیا گیا تھا' یہی وجہ ہے کہ یروشلم کونسل کی صدارت انہوں نے کی (اعمال: ۱۵:۱۹)۔ یروشلم کونسل میں اگرچہ انہوں نے ہی یہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ غیر قوموں کے لیے ختنہ وغیرہ کو دین عیسوی میں داخل ہونے کی شرط قرار نہ دیا جائے' لیکن اس بات پر تقریباً تمام عیسائی علماء کا اتفاق ہے کہ ان کا یہ فتویٰ عبوری اور عارضی حیثیت رکھتا تھا' ورنہ وہ تورات کے سختی کے ساتھ پابندی کے قائل تھے۔ پھر لطف کی بات یہ ہے کہ یروشلم کونسل کے بعد کتابِ اعمال میں یعقوب کا ذکر صرف ایک جگہ آیا ہے۔ وہاں بھی یعقوب نے پولس کو تورات کی خلاف ورزیوں پر کفارہ ادا کرنے اور تورات پر عمل کرنے کی تلقین کی ہے (اعمال :۲۱:۱۷تا۲۶)۔ رہا وہ خط جو یعقوب کی طرف منسوب ہے اس کے بارے میں جیمس میک کنن لکھتے ہیں: ''دلائل کا وزن اس بات کی تائید نہیں کرتا کہ اس کا مصنف یعقوب ہے۔''

سینٹ پیٹرز (پطرس حواری)

کتاب اعمال جو حواریوں کے کارناموں کو تفصیل سے بیان کرتی ہے' پندرہویں باب تک پطرس کی تقریباً تمام سرگرمیوں پر مفصل روشنی ڈالتی ہے' اس تمام عرصے میں پطرس اور پولس ہم خیال نظر آتے ہیں' لیکن انتہائی حیرت انگیز بات یہ ہے کہ کتاب اعمال جس کی تصنیف کا مقصد ہی حواریوں کی سرگزشت بیان کرنا ہے' پندرہویں باب کے بعد حواریوں کے سردار پطرس کے حالات بیان کرنے سے یک بیک خاموش ہو جاتی ہے' اور اس میں آخر (باب ۲۸) تک پطرس کا کہیں نام نظر نہیں آتا۔ جیمس میک کنن لکھتے ہیں:

''یروشلم کی کانفرنس کے بعد پطرس کتاب اعمال کے واقعات سے غائب ہو جاتا ہے۔''

اور انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا میں ہے:

''کتابِ اعمال میں پطرس کا آخری تذکرہ یروشلم کونسل سے متعلق ہے جس میں اس نے غیر قوموں سے متعلق نہایت وسیع المشربی کی پالیسی اختیار کی تھی۔''

قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ پطرس جیسا شخص جسے ''اعظم الحواریین'' کا لقب دیا گیا ہے' اور پندرہویں باب سے پہلے کتاب اعمال کا کوئی صفحہ جس کے تذکرے سے خالی نہیں ہے' اچانک اتنا غیر اہم کیوں بن جاتا ہے کہ آگے اس کا کہیں نام بھی نہیں آتا؟ اس سوال کا جواب بھی گلتیوں کے نام پولس کے خط کی اس عبارت سے ملتا ہے:

گلتیوں کے نام خط' باب ۲' آیت ۱۱: ''لیکن جب کیفا (یہ پطرس کا دوسرا نام ہے) انطاکیہ

میں آیا تو میں نے روبرو ہو کر اس کی مخالفت کی' کیونکہ وہ ملامت کے لائق تھا۔''

یہ واقعہ یروشلم کونسل کے متصل بعد کا ہے لہٰذا کیا اس سے واضح طور پر یہ نتیجہ نہیں نکلتا کہ یروشلم کونسل تک چونکہ پطرس نے پولس کی کوئی مخالفت نہیں کی تھی' اس لیے پولس کا شاگرد لوقا اپنی کتابِ اعمال میں اس کے اس زمانے کے حالات تفصیل سے ذکر کرتا رہا' لیکن جب اس کونسل کے بعد پطرس انطاکیہ گئے' اور وہاں پولس کے خود ساختہ نظریات کے سبب ان کا پولس سے اختلاف ہو گیا تو لوقا نے ان کے حالات لکھنے بند کر دیے۔

ان شواہد کی روشنی میں یہ گمانِ غالب قائم ہوتا ہے کہ انطاکیہ میں اس اختلاف کے پیش آ جانے کے بعد پطرس نے بھی برنباس کی طرح پولس سے علیحدگی اختیار کر لی تھی اور انہوں نے بھی پولس سے الگ کوئی جماعت بنالی تھی' تاکہ دین عیسوی کے صحیح عقائد کی تبلیغ کی جائے' اس کی تائید پولس کی ایک اور عبارت سے بھی ہوتی ہے:

کرنتھیوں کے نام خط' باب ۱' آیت ۱۲: ''مجھے خلوے کے گھر والوں سے معلوم ہوا کہ تم میں جھگڑے ہو رہے ہیں' میرا یہ مطلب ہے کہ تم میں سے کوئی اپنے آپ کو پولس کا کہتا ہے' کوئی اپلوس کا' کوئی کیفا کا' کوئی مسیح کا۔''

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کیفا (یعنی پطرس) نے اپنی الگ جماعت بنالی تھی جو پولس کی جماعت سے ممتاز تھی' اور ان دونوں جماعتوں میں جھگڑے ہو رہے تھے۔

پطرس کے خطوط

یہاں ایک شبہ یہ ہو سکتا ہے کہ بائبل کے عہد نامہ جدید میں پطرس کے دو خط شامل ہیں' ان خطوط میں پطرس نے تقریباً انہی نظریات کا اظہار کیا ہے جو پولس کے نظریات تھے' بلکہ دوسرے خط میں تو یہاں تک لکھا ہے: ''ہمارے پیارے بھائی پولس نے بھی اس حکمت کے موافق جو اسے عنایت ہوئی' تمہیں یہی لکھا ہے'' (۲۔پطرس ۳:۱۵)۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پولس اور پطرس میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ ان دونوں خطوط کے بارے میں خود عیسائی محققین کی رائے یہ ہے کہ ان کی نسبت پطرس حواری کی طرف درست نہیں ہے بلکہ یا تو یہ کسی اور شخص کے ہیں جن کا نام پطرس تھا یا پھر کسی نے اسے جعلی طور پر پطرس حواری کی طرف منسوب کیا ہوگا۔ جہاں تک پہلے خط کا تعلق ہے اس کے بارے میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے مقالہ نگار لکھتے ہیں:

''بہت سے ناقدوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اس خط کے مضامین ایک ایسی تاریخ سے متعلق ہیں جو پطرس کی وفات کے بعد کی تاریخ ہے' مثلاً (الف) اس خط کے ۱:۶' ۲:۱۲' ۱۴:۱۲ تا ۱۹ اور ۵:۹ میں مصائب اور آزمائشوں کا ذکر ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کے عیسائی ایک خوفناک آزمائش سے گزر رہے تھے' انہیں ملامتیں اور بدنامیاں برداشت کرنی پڑ رہی تھیں ..... یہ تمام حالات ان حالات کے ٹھیک مطابق ہیں جو پلینی نے ٹراجان کے نام خط میں بیان کیے ہیں' لہٰذا اس دلیل کی روشنی میں یہ کہا گیا ہے کہ پطرس کا پہلا خط اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے' اور پطرس کی وفات کے بہت بعد لکھا گیا ہے۔''

انسائیکلوپیڈیا کے مقالہ نگار نے آگے اس بات پر مزید دلائل پیش کیے ہیں کہ یہ خط پطرس کا نہیں ہے۔

رہا دوسرا خط' سو اس کی حالت پہلے خط سے بھی زیادہ نازک ہے' اس کا حال بیان کرتے ہوئے انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

''جس طرح پطرس کے پہلے خط کو کیتھولک خطوط میں سب سے پہلے بائبل کی فہرست میں جگہ دی گئی تھی' اس طرح اس دوسرے خط کو سب سے آخر میں جگہ دی گئی' اسکندریہ میں اسے تیسری صدی کے اندر تسلیم کیا گیا تھا' وہاں سے یہ قسطنطنیہ کے کلیسا کی فہرست مسلّمہ میں شامل ہوا' لیکن روم میں اسے چوتھی صدی سے پہلے قبولیت حاصل نہ ہو سکی اور سوریا کے کلیسا نے تو اسے چھٹی صدی میں قبول کیا۔''

اس خط کی اصلیت پر مندرجہ ذیل اعتراضات کے مجموعی وزن کی وجہ سے عام طور پر اس دعوے کو غلط سمجھا گیا ہے کہ اس کا مصنف پطرس ہے:

۱) پہلا شخص جس نے اسے پطرس کی تصنیف قرار دیا ہے' آریجن ہے' اور وہ خود اس بات کا اعتراف کرتا ہے کہ اس کی اصلیت متنازع فیہ ہے۔

۲) اس کا اسلوب' زبان اور خیال نہ صرف پطرس کے پہلے خط سے بلکہ پورے عہد نامہ جدید سے مختلف ہیں۔

۳) یہوداہ کی شرکت اس خط کے پطرس کی تحریر ہونے کو اور مشتبہ بنا دیتی ہے۔

۴) اس خط کے ۳:۱۶ میں پولس کے خطوط کو جو الہامی طور پر قابل تسلیم قرار دیا گیا ہے' اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ یہ خط دوسری صدی سے پہلے کا لکھا ہوا نہیں ہے۔

۵) خود محقق عیسائی علماء اس خط کو پطرس کی تصنیف ماننے سے انکار کرتے ہیں' لہٰذا ان خطوط کی بنا پر یہ نہیں کیا جا سکتا کہ پطرس پولس کے ہم خیال تھے' اور دونوں میں کوئی نظریاتی اختلاف نہیں تھا۔

جدائی کے بعد برنباس حواری کہاں گئے

آیئے! اب ذرا یہ دیکھنے کی کوشش کریں کہ برنباس پولس سے اس سنگین اختلاف کی وجہ سے جدا ہو کر کہاں گئے۔ کتابِ اعمال سے تو صرف اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ پولس سے جدا ہونے کے بعد یوحنا مرقس کو لے کر قبرص چلے گئے تھے' مگر اس جملے کے بعد کتابِ اعمال ان کا کچھ حال بیان نہیں کرتی' دوسری عیسائی تاریخیں بھی برنباس کی آئندہ زندگی کے متعلق بالکل خاموش ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مقالہ نگار لکھتا ہے:

''برنباس مرقس کو لے کر بذریعہ جہاز قبرص چلا جاتا ہے تاکہ وہ اپنا کام جاری رکھے' اس سے آگے اس کے متعلق تاریخ کی دھند چھا جاتی ہے۔''

سوال یہ ہے کہ برنباس جو کلیسا کے ابتدائی دور میں اہم ترین شخصیت تھا اور جس نے اپنی ساری زندگی دعوت و تبلیغ میں صرف کی تھی' کیا پولس سے اختلاف کرنے کے بعد اس لائق بھی نہیں رہتا کہ پولس کے شاگرد (لوقا وغیرہ) چند سطروں میں اس کا کچھ حال ذکر کریں؟

اس سے سوائے اس کے اور کیا نتیجہ اخذ کیا جا سکتا ہے کہ برنباس پولس کی اصل حقیقت جان چکا تھا اور اس کے بعد اس کی تمام تر کوششیں یہ رہی ہوں گی کہ پولس نے دین عیسوی میں جو تحریفات کی ہیں ان سے لوگوں کو باخبر کیا جائے' اور ظاہر ہے کہ یہ سرگرمیاں ایسی نہ تھیں کہ پولس کے شاگرد انہیں ذکر کرنا پسند کرتے۔

انجیل برنباس

یہ عقلی نتیجہ تقریباً واقعہ بن جاتا ہے جب ہم یہ دیکھتے ہیں کہ سولہویں صدی میں پوپ اسکٹس پنجم کے خفیہ کتب خانے سے برنباس کی لکھی ہوئی انجیل برآمد ہوتی ہے' جس کے پہلے ہی صفحے پر یہ عبارت ہے کہ:

''اے عزیزو! اللہ نے جو عظیم اور عجیب ہے' اس آخری زمانے میں ہمیں اپنے نبی یسوع مسیح کے ذریعے ایک عظیم رحمت سے آزمایا' اس تعلیم اور آیتوں کے ذریعہ جنہیں شیطان نے بہت سے لوگوں کو گمراہ کرنے کا ذریعہ بنایا ہے جو تقویٰ کا دعویٰ کرتے ہیں'

اور سخت کفر کی تبلیغ کرتے ہیں' مسیح کو اللہ کا بیٹا کہتے ہیں' ختنہ کا انکار کرتے ہیں جس کا اللہ نے ہمیشہ کے لیے حکم دیا ہے' اور ہر نجس گوشت کو جائز کہتے ہیں' انہی کے زمرے میں پولس بھی گمراہ ہو گیا' جس کے بارے میں مَیں کچھ نہیں کہہ سکتا مگر افسوس کے ساتھ' اور وہی سبب ہے جس کی وجہ سے وہ حق بات لکھ رہا ہوں جو میں نے یسوع کے ساتھ رہنے کے دوران سنی اور دیکھی ہے تاکہ تم نجات پاؤ اور تمہیں شیطان گمراہ نہ کرے..... اور تم اللہ کے حق میں ہلاک ہو جاؤ اور اس بنا پر ہر اس شخص سے بچو جو تمہیں کسی نئی تعلیم کی تبلیغ کرتا ہے' جو میرے لکھنے کے خلاف ہو' تاکہ تم ابدی نجات پاؤ۔'' (برنباس ۱:۳ تا ۹)

یہی برنباس کی وہ انجیل ہے جسے عرصہ دراز تک چھپانے اور مٹانے کی بڑی کوششیں کی گئیں اور جس کے بارے میں پانچویں صدی عیسوی میں (یعنی آنحضرت محمد ﷺ کی دنیا میں تشریف آوری سے بیسیوں سال پہلے) پوپ جیلاشیُس اوّل نے یہ حکم جاری کر دیا تھا کہ اس کتاب کا مطالعہ کرنے والا مجرم سمجھا جائے گا اور آج یہ کہا جاتا ہے کہ یہ کسی مسلمان کی لکھی ہوئی ہے۔

کیا اس کے بعد بھی اس بات میں کسی شبہ کی گنجائش رہ جاتی ہے کہ موجودہ عیسائی مذہب سراسر پولس کے نظریات ہیں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام یا آپ کے حواریوں کا اس سے کوئی تعلق نہیں۔

عیسائی حضرات کے پاس اب بھی موقع ہے' غور کر لیں' اپنی پوری تحقیق کر لیں' اچھی طرح اس مذہب کی تصدیق کر لیں جسے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کا پیش کردہ مذہب سمجھ رہے ہیں' کہیں وہ در پردہ حضرت مسیح علیہ السلام کے دین سے بالکل مخالف کوئی راستہ تو نہیں ہے' کیونکہ وہ بھی ہماری طرح حضرت عیسیٰ یسوع مسیح ابن مریم علیہ السلام ہی کے منتظر ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ جب حضرت مسیح علیہ السلام آسمانوں سے تشریف لائیں تو انہیں پہچاننے سے ہی انکار کر دیں اور ان کی ساری کی ساری محنت اور عبادت و ریاضت ضائع ہو جائے جسے وہ حضرت مسیح علیہ السلام کی پیروی سمجھتے ہوئے کر رہے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی مقبولِ عام تالیف

مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق

اشاعت خاص: 40 روپے اشاعت عام: 25 روپے

بقیہ: عرض احوال

اصل بات یہ ہے کہ جس انداز میں اور جن حکمرانوں نے OIC کے نام سے تنظیم بنا رکھی ہے وہ اُسے کیسے ایک مضبوط اور اسلام دشمن قوتوں کا منہ توڑ جواب دینے والی تنظیم بنا سکیں گے؟ اس لیے کہ تمام مسلم حکمران' الا ماشاء اللہ' اُن کے سیاسی غلام ہیں یا معاشی لحاظ سے محتاج ہیں جو مسلمانوں کے خون کے پیاسے ہیں۔ ہم اپنے دشمنوں سے کیسے توقع رکھیں کہ وہ ہمیں اپنے آپ کو ایک مضبوط تنظیم میں پرو لینے کی اجازت دے دیں گے۔ ذوالفقار علی بھٹو اور شاہ فیصل شہید نے اگرچہ خلوص کے ساتھ لیکن بغیر بنیادی تیاری کے مسلمانوں کا بلاک بنانے کی کوششوں کا ابھی آغاز ہی کیا تھا کہ دشمنوں نے دونوں کو ٹھکانے لگا دیا۔ آج کے مسلمان حکمرانوں نے اِسی خوف سے نہ صرف OIC کو منجمد کر کے رکھا ہوا ہے' بلکہ مسلمانوں کا قتل عام کرنے میں دشمنوں کے فرنٹ لائن اتحادی بنے ہوئے ہیں۔ لہٰذا ہم پھر اِسی نتیجہ پر پہنچیں گے کہ جب تک استعمار کے ایجنٹ یہ نام نہاد مسلمان حکمران اپنا قبلہ درست نہیں کر لیتے یا ہم اِن سے نجات حاصل نہیں کر لیتے اُس وقت تک اُمت مسلمہ حقیقت میں ایک قوت نہیں بن سکے گی۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ یہ کام صرف علماء کرام یا سیاسی لیڈروں کا یا اسلام پسند دانشوروں کا ہے تو یہ بہت بڑا مغالطہ ہے۔ یہ کام بحیثیت مجموعی پوری امت کا ہے' تمام مسلمانوں کو امت سازی کے اس فریضہ کو مقدس فرض سمجھ کر ادا کرنا ہوگا۔ مسلمانانِ پاکستان کو اِس حوالہ سے اپنی خصوصی ذمہ داری سمجھنی اور نبھانی چاہیے۔ اِس لیے کہ عالم اسلام ہی میں نہیں دنیا کے کل ایک سو ننانوے (199) ممالک میں پاکستان واحد ملک ہے جس کے ماتھے پر ''اسلام'' کا لفظ بڑے واضح طور پر کنداں ہے۔ ہم نے یہ ملک وطنی قومیت کی کلیتاً نفی کر کے حاصل کیا تھا۔ اِسی نظریہ کو برآمد کرنے سے ایک زور آور اُمت مسلمہ وجود میں آ سکتی ہے۔

ہماری ویب سائٹ

www.tanzeem.org

پر ملاحظہ کیجیے:

☆ تنظیم اسلامی کا تعارف
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد کا مکمل دورۂ ترجمۂ قرآن
☆ بانیٔ تنظیم اسلامی اور امیر تنظیم اسلامی کے مختلف خطابات
☆ تلاوتِ قرآن' دروسِ قرآن' دروسِ حدیث اور خطاباتِ جمعہ
☆ صحیح بخاری' صحیح مسلم' موطا امام مالک اور اربعین نوویؒ کے تراجم
☆ میثاق' حکمت قرآن اور ندائے خلافت کے تازہ اور سابقہ شمارے
☆ اردو اور انگریزی کتابیں
☆ آڈیو ویڈیو کیسٹس' سی ڈیز اور مطبوعات کی مکمل فہرست

کاروباری اور ملازمت پیشہ افراد (مرد حضرات) کے لیے بنیادی دینی علوم سے آگاہی کا موقع

مرکزی انجمن خدام القرآن کے شعبۂ تدریس کے زیرِ اہتمام

6 فروری سے

فہم دین کورس

(موڈیول I اور II) کا آغاز ہو رہا ہے۔ (ان شاء اللہ)

نصاب (موڈیول I)

- عربی گرامر (تیسیر القرآن کے پہلے 20 اسباق)
- تجوید و ناظرہ
- مطالعہ حدیث (منتخب نصاب حدیث)
- ایمانیات

نصاب (موڈیول II)

- عربی گرامر (تیسیر القرآن کے آخری دس اسباق)
- ترجمہ قرآن مع عربی گرامر
- تجوید و حفظ
- توسیعی محاضرات (بنیادی اصطلاحات حدیث، قرآن فہمی کے اہم اصول اور مآخذ، دینی موضوعات پر لیکچرز)

دورانیہ: 4 ماہ **اوقات تدریس:** مغرب تا عشاء (سوموار تا جمعرات)

نوٹ: موڈیول II میں داخلے کے لیے موڈیول I کا پاس ہونا یا داخلہ ٹیسٹ پاس کرنا لازمی ہے۔

داخلہ کے خواہشمند حضرات قرآن اکیڈمی 36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور کے استقبالیہ سے داخلہ فارم حاصل کریں اور 6 فروری تک وہیں جمع کرا دیں۔

برائے رابطہ: **قرآن اکیڈمی**
36-K، ماڈل ٹاؤن، لاہور۔ فون: 042-35869501-3، irts@tanzeem.org
نیشان دانش 0336-4205587
0333-4430391

زندگی کے سارے سُکھ، صحت اور تن دُرستی سے ہیں

ایلوویرا اور منتخب نباتات کا صحت افزا مرکّب

تن سُکھ سے تن دُرست

تن سُکھ جسم وجاں کو تقویت پہنچاتا ہے، نظامِ ہضم اور افعالِ جگر کی اصلاح کرتا ہے۔

ہمدرد

مدینۃ الحکمہ: تعلیم، سائنس اور ثقافت کا عالمی منصوبہ

ہمدرد کے متعلق مزید معلومات کے لیے ویب سائٹ ملاحظہ کیجیے:
www.hamdard.com.pk

Adarts -HTS-12/07(R)

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے

سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہج انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر
مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل
اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک'
اسلامی انقلاب کے مراحل' مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم **ڈاکٹر اسرار احمد** رحمۃ اللہ علیہ
کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

صفحات: 375 ❁ قیمت: اشاعت خاص: 400 روپے، اشاعت عام: 200 روپے

❁❁❁

"منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

صفحات: 64 ❁ قیمت اشاعت خاص: 40 روپے ❁ اشاعت عام: 20 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501

اُسوہ وسیرتِ رسول اکرم ﷺ

پر ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی چند فکر انگیز تالیفات

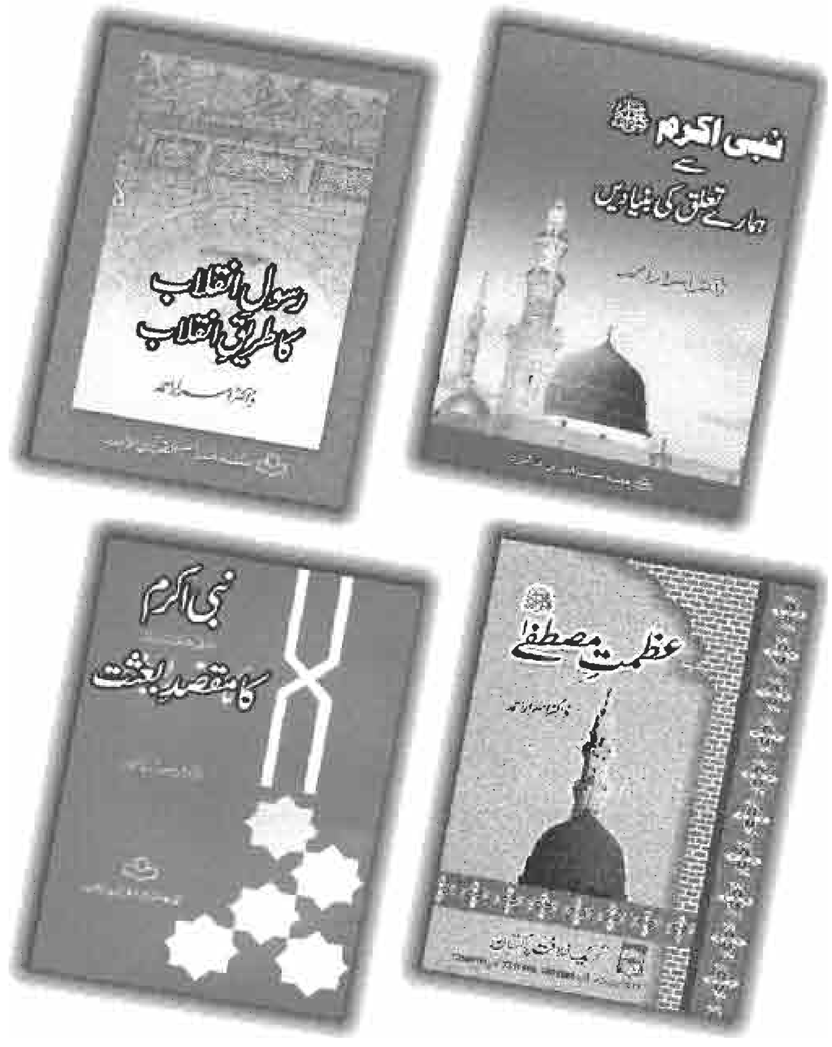

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501
email:maktaba@tanzeem.org